قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر
1998ء

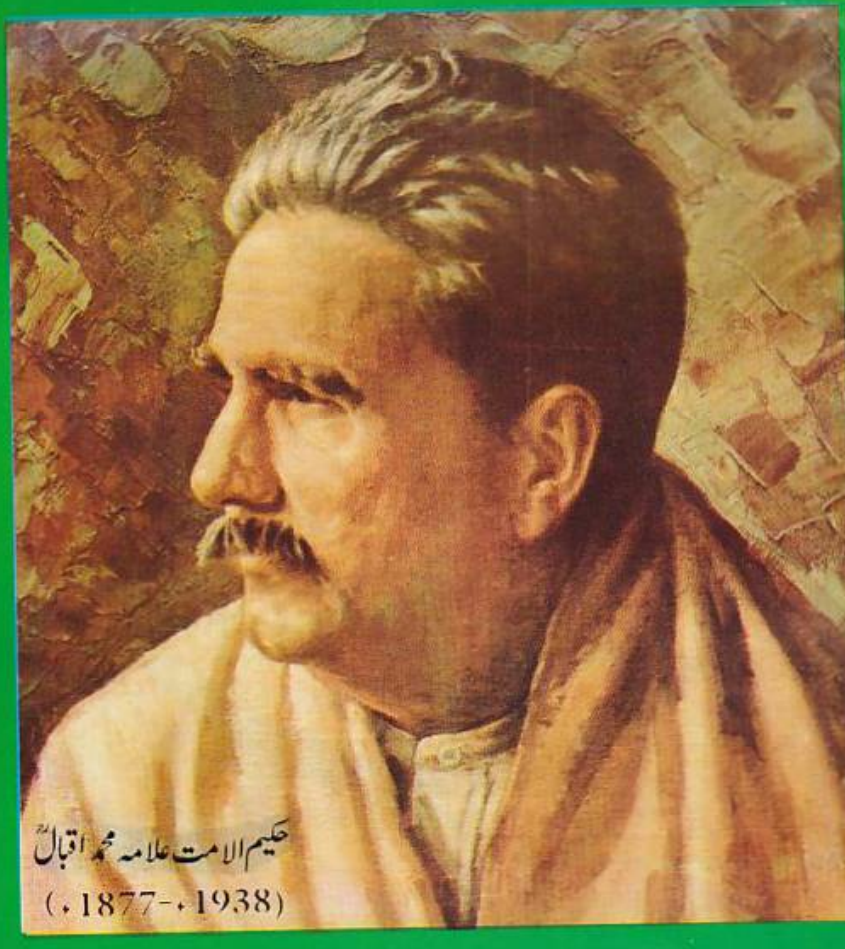

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ
(1877ء-1938ء)

کامل مومن وہ ہے جو خوش اخلاق اور گھر والوں سے نرم سلوک کرنے والا ہو۔ (ترمذی)

A perfect believer is that who is nice in behaviour and kind to his family members. (Tirmizi)

SHAHAB

QUALITY PISTON RINGS

THE ONLY MANUFACTURERS OF INTERNATIONAL QUALITY PISTON RINGS IN PAKISTAN.

MINIMIZE WEAR
RESTORE COMPRESSION
GET MORE POWER
CONTROL OIL

CALL US FOR THE EXCELLENT RECONDITIONING OF AUTOMOBILE ENGINES OF ALL KINDS.

M. SHAH MOHAMMAD & SONS (PVT.) LTD.

OUTSIDE PAK GATE, MULTAN, PAKISTAN

PHONE OFFICES: : 545071, 43671, 539071-73

FACTORY 550171

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

25-B گلبرگ 2 طلوعِ اسلام روڈ لاہور 54660
Phone: 5714546/5753666/5764484

چیئرمین: ایاز حسین انصاری
ناظم: محمد لطیف چوہدری

نومبر 1998ء

ناشر: عطاء الرحمٰن ارائیں
سرکولیشن منیجر: مرزا زمرد بیگ

ایڈیٹر
محمد لطیف چوہدری

مدیر معاون: سلیم اختر
مجلس مشاورت: عبداللہ ثانی۔ ڈاکٹر صلاح الدین اکبر۔ بشیر احمد عابد

مجلہ طلوعِ اسلام کا سالانہ زرِ شرکت

پاکستان میں	۱۷۰/- روپے
یورپ اور مڈل ایسٹ	۶۰۰/- روپے
امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا	۸۰۰/- روپے

ادارہ طلوعِ اسلام کا اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: ۳۰۸۲۰۷ نیشنل بنک
مین مارکیٹ گلبرگ۔ لاہور

اشتہارات کے نرخ یہ ہیں

صفحات	ایک بار	سال بھر کے لئے
باہر ٹائیٹل	۸۰۰/- روپے	۶۰۰۰/- روپے
اندر ٹائیٹل	۶۰۰/- روپے	۵۰۰۰/- روپے
اندر کے صفحات	۵۰۰/- روپے	۴۰۰۰/- روپے
نصف صفحہ	۳۰۰/- روپے	۲۰۰۰/- روپے

مذکورہ شرح ایک رنگ کے اشتہار کے لئے ہے۔
اُجرت اشتہار مسودہ کے ہمراہ ارسال کریں۔

۱۵ روپے

مقام اشاعت: 25 بی گلبرگ 2 - لاہور

پرنٹر: خالد منصور نسیم؛ پریس طیب اقبال پرنٹرز ۱۷ بی رائل پارک۔ لاہور

EMAIL: Idara@toluislam.com ------ WEB: www.toluislam.com

اہم باتیں

1 کنونشن 1998-31 اکتوبر سے 2 نومبر تک تین دن کے لئے ہو گی۔

2 سیمینار بعنوان "اقبال اور قرآن" - یکم نومبر 98 کو ایوان اقبال، ایجرٹن روڈ، نزد فلیٹیز ہوٹل، لاہور میں ہو گا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

3 مندوبین اور ان کے ہمراہ آنے والے مہمانوں کے لئے رہائش کا بندوبست ڈان ماڈل ہائی سکول، قرآنک ریسرچ سنٹر، لب نہر، جوہر ٹاؤن میں کیا گیا ہے۔

رہائش صرف اراکین بزم اور ان کے ہمراہ تشریف لانے والے مہمانوں کو فراہم کی جائیگی۔ 30 اکتوبر کو آنے والے حضرات ادارہ تشریف لائیں جبکہ 31 اکتوبر کو پہنچنے والے احباب سیدھے جوہر ٹاؤن پہنچیں۔ مغرب کی طرف سے آنے والے حضرات ریلوے سٹیشن اور مشرق کی طرف سے آنے والے ٹھوکر نیاز بیگ اتریں۔ 77 نمبر ویگن انہیں "سوا (راجباہ) سماہنی سٹاپ" پہنچا دیگی۔ صرف سیمینار میں حصہ لینے والے احباب یکم نومبر 98ء کو صبح ساڑھے 8 بجے ایوان اقبال تشریف لائیں۔

4 سیمینار کے لئے دعوت عام ہے، علامہ اقبالؒ کی پیش کردہ قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص اس میں شرکت کر سکتا ہے۔ اپنی قریبی بزم یا ادارہ کو براہ راست خط لکھ کر یا فون کر کے **"ایوان اقبال"** میں اپنی نشست البتہ محفوظ کروا لیں۔ دعوت نامہ اطلاع دینے والے حضرات کو ایوان اقبال کے صدر دروازے پر بھی فراہم کر دیا جائیگا۔

چیئرمین ادارہ

PAMPHLETS-- پمفلٹ

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے۔ مندرجہ ذیل پمفلٹس دو روپے فی پمفلٹ کے حساب سے ڈاک ٹکٹ بھجوا کر طلب فرمائیں۔

1 آرٹ اور اسلام
2 احادیث کا صحیح ترین مجموعہ
3 اسلام کیا ہے؟
4 الزکوٰۃ
5 اسلام آگے کیوں نہ چلا؟
6 اسلامی قوانین کے راستے میں کون حائل ہے؟
7 اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟
8 الصلوٰۃ
9 اندھے کی لکڑی
10 بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
11 جہاں مارکس ناکام رہ گیا
12 حرام کی کمائی
13 خدا کی مرضی
14 دعوت پرویز کیا ہے؟
15 دو قومی نظریہ
16 روٹی کا مسئلہ
17 سوچیو (سندھی)
18 سوچا کرو
19 عالمگیر افسانے
20 عورت قرآن کے آئینے میں
21 فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں؟
22 قرآن کا سیاسی نظام
23 قرآن کا معاشی نظام
24 قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر
25 کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
26 کافر گری
27 مرض تشخیص اور علاج
28 مقام اقبالؒ
29 مرزائیت اور طلوع اسلام
30 مقام محمدی ﷺ
31 ماؤزے تنگ اور قرآن
32 ہم میں کریکٹر کیوں نہیں؟
33 ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
34 Islamic Ideology
35 Is Islam a Failure
36 Why Islam is the Only True Deen?

فہرست

لمعات	ادارہ	5
اقبالؒ کا پاکستان	علامہ اقبالؒ	9
اسلامی مملکت کا تصور (اقبالؒ کے نزدیک)	علامہ غلام احمد پرویز	19
شہر مرغدین	علامہ غلام احمد پرویز	37
اقبالؒ اور طلوع اسلام	بشیر احمد عابد (کویت)	43
تقدیر کے عقیدہ جبر پر علامہ اقبالؒ کی ضرب کاری	سید انعام الحق	51
جہاں قانون بکتا ہے	آصف جلیل (کراچی)	56
Iqbal The Universal Poet	Ms. Shamim Anwar	64

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(1) شریعت بل

9 اکتوبر 1998ء کی صبح قومی اسمبلی نے قرآن و سنت کی بالا دستی قائم کرنے کے لئے پندرھواں ترمیمی بل کثرت رائے سے اس استثناء کے ساتھ منظور کر لیا کہ مسلمانوں میں موجود فرقے شخصی معاملات کی حد تک اپنے اپنے طور طریقے جاری رکھ سکیں گے۔ اس استثناء کے ساتھ جسے دستور کے آرٹیکل 2-B میں بطور وضاحتی نوٹ شامل کیا گیا ہے فرقوں کے وجود کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے لہٰذا فرقے اپنی اپنی بالا دستی قائم کرنے کے لئے فرقہ واریت کا عمل جاری رکھ سکیں گے اور اس طرح عملاً جو کچھ ہو گا وہ قرآن و سنت کی نہیں' فرقوں کی بالادستی ہو گی۔ یہ درست ہے کہ مسلمانوں کے رگ وپے میں بسی ہوئی فرقہ واریت کو بیک قلم ختم کرنا ممکن نہ تھا لیکن اب جب کہ قرآن و سنت کی بالادستی تسلیم کر لی گئی ہے اور قرآنی تعلیمات کو نافذ کرنا حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل کر دیا گیا ہے' ہم امید کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی واضح تعلیمات کی روشنی میں دوسرا قدم آئین کی شق 2-B کے تحت دی گئی اس استثناء کو ختم کرنے کے لئے اٹھایا جائیگا جس سے فرقہ واریت کو ہوا ملتی ہے اور جس کے لئے قرآن و سنت میں کوئی گنجائش موجود نہیں۔ قرآن کریم کی وہ آیات جن کی رو سے فرقہ بندی ممنوع ہی نہیں جرم قرار پاتی ہے طلوع اسلام مسلسل دہراتا چلا آرہا ہے۔ طلوع اسلام آج بھی کہتا ہے کہ رکئے اور سوچئے! اسلامی دستور اور اس میں مذہبی فرقوں کا آئینی تحفظ۔ یا للعجب! ایک طرف تو فرقہ واریت کے ناگ کو دودھ پلایا جا رہا ہے۔ دوسری طرف اس کی تباہ کاریوں پر واویلا کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اس امت واحدہ کو صاف لفظوں میں کہہ دیا وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (3:103)- تم سب مل کر اس ضابطہ خداوندی کو محکم طور پر تھامے رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ۔ حبل اللہ ایک ہے ایک سے زیادہ نہیں۔ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ... (42:13)- تم سب اسی دین کو قائم کرو اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ نہ پیدا کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت سے مسلمانوں سے کہہ دیا کہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ.... (3:104)- دیکھنا تم بھی کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح حقائق مل جانے کے بعد فرقے بنا لئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگ گئے و اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (3:104)- یہ لوگ جو فرقوں میں بٹ جاتے ہیں اور آپس میں اختلاف کرنے لگ جاتے ہیں ان پر سخت عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ فرقہ بندی عذاب کی زندگی ہے اور ہم اسی عذاب میں گرفتار ہیں۔ اختلاف اور فرقہ بندی کی زندگی لعنت اور عذاب کی زندگی ہے۔ خدا کی رحمت تو ان پر ہوتی ہے جو امت واحدہ بن کر رہتے ہیں اور اختلافات سے بچتے ہیں۔ قرآن نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر کہہ دیا کہ:

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا (30:31-32)۔
یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقے بن گئے۔۔ اس فرقہ بندی میں ہوتا یہ ہے کہ ہر فرقہ اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی فرقے باطل پر ہیں۔ فرقہ پرستی کی یہ وہ نفسیات ہے جس کا مشاہدہ ہم ہر روز ہر جگہ کرتے ہیں۔ بہرحال قرآن نے امت واحدہ سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر تم نے دین میں فرقے پیدا کر لئے تو یہ توحید نہیں شرک ہو گا اور کوئی فرقہ یہ کہہ کر اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکے گا کہ ہم اصلی اور حقیقی اسلام پر قائم ہیں اور دوسرے فرقے باطل پر ہیں۔ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ سے کہہ دیا گیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ..... (6:160)۔ جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور ایک فرقہ بن کر بیٹھ جائیں اے رسول ﷺ! تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں (کیونکہ وہ توحید پرست نہیں رہتے مشرک ہو جاتے ہیں)۔

دین ایک راستے پر چلنے کا نام ہے' مختلف راستوں پر چلنے کا نہیں لیکن ہمارے مذہبی پیشوا اپنی عافیت امت کی تفریق میں سمجھتے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ اگر اللہ کا دین رائج ہو گیا تو ان کی اجارہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔ ان سے فرقہ پرستی کے خاتمہ کی توقع عبث ہے۔ یہی تو ہیں جو قرآن کے الفاظ میں اللہ کے راستے میں رکاوٹ بنے ہیں۔ (9:34)۔

حکومت کو چاہئے کہ دورنگی چھوڑ دے' فرقہ پرستی کو قانونی تحفظ نہ دے۔ قوانین کا اطلاق ہر ایک پر یکساں ہو' پرسنل لاز کا وجود ختم کر دے کیونکہ یہ سیکولر سٹیٹ کی پہچان ہے۔

(2) کیا نفاذ شریعت سے تمام مسائل حل ہو جائیں گے؟

نفاذ شریعت کے سلسلے میں دوسرا خطرناک پہلو وہ سبز باغ ہیں جو وزیراعظم صاحب اپنی تقاریر میں لوگوں کو دکھا رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ اور رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے ثمرات وزیراعظم صاحب کے بیان کردہ محاسن سے بڑھ کر ہیں لیکن یہ ثمرات اسمبلی میں بل پاس کر دینے سے ہی حاصل نہیں ہو جاتے۔ قوم ان تجربات سے پہلے بھی دوچار ہو چکی ہے۔

تحریک پاکستان کے دوران لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بھی موجزن تھا کہ ہماری تمام کمزوریاں' نقائص' عیوب اور برائیاں انگریزوں کی غلامی کی وجہ سے ہیں' جوں ہی ہم نے آزادی حاصل کر لی' یہ تمام عیوب و نقائص خود بخود کم ہو جائیں گے۔ پاکستان بننے کے بعد جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ تمام برائیاں بدستور موجود ہیں' موجود ہی نہیں بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ہو چکی ہیں تو انہیں بڑا دھچکا لگا۔ انہوں نے اس صورت حال کا ذمہ دار خود پاکستان کو قرار دے دیا۔ ہم اس وقت اس نکتہ پر بحث نہیں کرنا چاہتے کہ یہ برائیاں ہم میں کیوں در آئیں' کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے دوران لوگ اس غلط خیال میں مبتلا تھے کہ جونہی پاکستان بنا یہ تمام برائیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔

اب لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھایا جا رہا ہے کہ یہ تمام برائیاں اور مسائل اس وجہ سے ہیں کہ یہاں شرعی قوانین (فقہ) نافذ نہیں۔ انہیں اس خیال میں مبتلا کیا جا رہا ہے کہ حکومت نے جونہی شرعی قوانین نافذ کئے ہماری برائیاں اور کمزوریاں سب دور ہو جائیں گی اور ان کی جگہ ہم میں محاسن ہی محاسن پیدا ہو جائیں گے۔ یہ خیال بھی غلط ہے اور

ہمیں خدشہ ہے کہ جس طرح پاکستان بننے کے بعد لوگوں کو دھچکا لگا تھا اسی طرح نفاذ شریعت کے بعد بھی اسی قسم کا ایک اور دھچکا لگے گا۔ جب ہم دیکھیں گے کہ نفاذ شریعت کے باوجود (جیسا کہ کچھ قوانین کے نفاذ کے بعد ہو چکا ہے) وہ برائیاں اور کمزوریاں اپنی جگہ بدستور موجود ہیں۔

برائیاں یا کمزوریاں آزادی مل جانے یا کسی قسم کے قوانین نافذ کرنے سے از خود دور نہیں ہوا کرتیں۔ برائیاں دور کرنے سے دور ہوا کرتی ہیں اور قرآن کریم کے مطابق معاشرتی برائیاں دور کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ افراد معاشرہ کی ان خطوط پر تعلیم و تربیت کی جائے جن سے مستقل انسانی اقدار پر صرف ایمان ہی نہیں بلکہ ان کے تحفظ کا جذبہ ان کے دلوں کی گہرائیوں سے ابھرے۔ صحیح قانون اس معاملہ میں صرف مد و مددگار ہو سکتا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہم نے اپنے اوپر کسی قسم کا کوئی ڈسپلن ہی نہیں رکھا اور ڈسپلن سے ہماری مراد ان مستقل اقدار کی پاسداری ہے جنہیں ہمارے اللہ نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے۔ اور جب زندگی کسی ڈسپلن کے ماتحت نہ رہے تو اس کا نتیجہ برائیوں کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کرتا۔ ہمارے معاشرے کا ماڈرن طبقہ قدامت پرست طبقے کو کوستا ہے کہ ان کے ہاں جمود و تعطل ہے اور قدامت پرست طبقہ ماڈرن طبقہ پر چیں بہ جبیں ہوتا ہے کہ یہ سب افرنگ زدہ ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان برائیوں اور کمزوریوں کی ذمہ داری نہ جدت پر عائد ہوتی ہے نہ قدامت پر۔ اس کا اصل راز یہ ہے کہ ہمارے جدید اور قدیم دونوں طبقے زندگی کے ڈسپلن سے عاری ہیں۔ ان کے ہاں بعض رسوم و قواعد کی سطحی اور ظاہری پابندیاں ہوتی ہیں۔ ماڈرن طبقہ کے ہاں انہیں (Etiquette) ایٹیکٹ کہا جاتا ہے اور قدامت پرست طبقہ اسے آداب اور اخلاق کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے۔ قلب و نگاہ پر نہ ان کے ہاں کوئی ڈسپلن ہے نہ ان کے ہاں۔ یہ ڈسپلن خارج سے عائد شدہ پابندیوں سے پیدا نہیں ہوا کرتا۔ یہ دل کی گہرائیوں سے ابھرا کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی قلب میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں جس سے اس کے اندر ڈسپلن کا جذبہ ابھرے' معاشرے کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے لیکن اس میں فرد کی اپنی کوشش اور عزم کا حصہ بھی کم نہیں ہوتا۔ اس باب میں ہم پر بہ حیثیت افراد جس قدر ذمہ داری عائد ہوتی ہے ہم نے اسے یکسر فراموش کر رکھا ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو یا دوسروں کو فریب دے رہے ہیں کہ اس کی واحد ذمہ داری ارباب حل و عقد پر ہے' جو ملک میں شرعی قوانین نافذ نہیں کرتے۔ ذمہ داری کو دوسری طرف منتقل کرنے کی بجائے ہمیں خود اپنا محاسبہ کرنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ اپنی اصلاح کے لئے جس قدر ہماری اپنی ذمہ داری ہے' ہم نے اسے کس حد تک پورا کیا ہے۔ دنیا میں جتنی قومیں ہم سے آگے ہیں ان کے حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ بیشتر ایسے امور ہیں جن میں ان کے افراد نے اپنے آپ پر از خود پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔

یاد رکھئے انسانی ذات جب تک خود نگر نہیں ہوتی اس میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہماری کمزوریوں اور برائیوں کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ ہم میں خود نگری نہیں رہی۔ ہم میں سے ہر شخص دوسرے کو دیکھتا ہے۔ اپنے آپ کو نہیں دیکھتا۔ خارج سے عائد کردہ قیود کے پابند جمادات' نباتات و حیوانات ہوتے ہیں۔ انسان کی سرفرازی کا راز اس میں ہے کہ وہ خود عائد کردہ حدود و قواعد کی کس قدر پابندی کرتا ہے۔ اس کے لئے کسی مجلس قانون ساز کے مرتب کردہ قوانین کا انتظار کرنا فریب نفس سے کم نہیں۔ یہ ہے تعلیم و تربیت کا وہ پروگرام جسے وجود میں لانا ضروری ہے لہٰذا اس سے پہلے کہ لوگوں میں پھر سے مایوسی پیدا ہونی شروع ہو جائے حکومت کو چاہئے کہ افراد معاشرہ کی ان خطوط پر تعلیم و تربیت کا مربوط پروگرام وضع کر کے اس کی ابتداء ارکان اسمبلی اور ممبران سینٹ سے کرے۔

علامہ اقبالؒ کا احسان

یہ ہے کہ اُنہوں نے صدیوں کے بعد، اسلام کا صحیح تصور ملّت کے سامنے پیش کیا ــــ اور

پرویز صاحبؒ کا احسان

یہ ہے کہ اُنہوں نے اقبالؒ کے فکر اور پیغام کو، اس کے حقیقی سرچشمہ

قرآن مجید کی روشنی میں،

قوم کو سمجھایا۔ ان کے چالیس سال پر پھیلے ہوئے خطابات، تقاریر اور مقالات، اسی فریضہ کی ادائیگی کے مظہر ہیں۔ جنھیں اب ــــــ

اِقبالؒ اور قرآن

کے حسین پیکر میں، بڑی آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے ــــ

اقبالؒ کی فکر ــــ قرآن کی روشنی ــــ پرویز صاحبؒ کی زبان

آپ خود سمجھ لیجئے کہ اس امتزاج کی کیفیت کیا ہو گی!

قیمت: سٹوڈنٹ =/175 اعلیٰ =/350

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبالؒ کا پاکستان

ہر چند ہم میں آج اقبالؒ موجود نہیں لیکن اقبال کی فکر ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم اس فکر کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک پاکستان کی اسلامی مملکت کا نقشہ کیا ہونا چاہئے تھا۔ ذیل میں ہم، فکر اقبال کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک ترتیب سے پیش کرتے ہیں تاکہ یہ ہمارے لئے نشانات راہ کا کام دے سکیں۔ ان میں سے کئی چیزیں اس سے پیشتر قارئین طلوع اسلام کے سامنے آچکی ہیں۔ لیکن یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جتنی بار سامنے آئیں ان کی افادی حیثیت بڑھتی جاتی ہے۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں ..... ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔

قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں!

عرشی صاحب کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ سے پوچھا کہ "خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے"؟ انہوں نے فرمایا "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں، ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفس اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا منشاء دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں"۔ (البیان- دسمبر 1929ء)

مقام حدیث۔

احادیث کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ ﷺ نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے، کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ ﷺ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔

شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول ﷺ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور

رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار احادیث پر کیوں نہیں رکھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے' امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام حنیفہؒ کے طرز عمل کے ہم آہنگ ہو گا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطبات اقبال ص 163-164)

احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کیا جائے۔

مجھ کو ان (مولانا خواجہ احمد الدین صاحب) کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعت محمدیہ ﷺ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں' جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیر غور ہیں۔ اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانہ حال کے مغربی اصول فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ کر دیا ہے' اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوام اسلامیہ کے لئے باعث برکت ہو گا یا شقاوت۔ غرضیکہ مولوی صاحب یا ان کے رفقاء کو جو کلام الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں' اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ "اشاعۃ القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ

سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد' عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں' ان پر قرآنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً" تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران' افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیوں کہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(مکتوب بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم۔ محررہ 2 ستمبر 1935ء)

مسلمانوں کا نصب العین

الفاظ شرف انسانی کے متعلق کسی کو دھوکہ نہیں ہونا چاہئے۔ اسلامیات میں ان سے مراد وہ حقیقت کبریٰ ہے جو حضرت انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی تقویم فطرۃ اللہ سے ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے اس تڑپ پر جو توحید الٰہی کے لئے اس کے رگ و ریشے میں مرکوز ہے۔ انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو' ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں کا' خونریزیوں کا اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسب منشاء الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمت للعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو امت مسلمۃ لک کہہ سکیں' اور اس کے فکر و عمل پر شھداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔

(حسین احمد مدنی کے جواب میں -- متعلقہ قومیت)

اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیت کو دعوت دیتا ہے۔

(1) اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے'

نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوع انسانی سے محبت رکھتے ہیں' ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود ملک پر ہے' دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوع کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوارتقا ہے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ بلکہ دراصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے:

تعالوا الی کلمت سواء بیننا و بینکم

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔۔ متعلقہ "فلسفہ سخت کوشی")

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اول یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد' اقوام انسانی کا امن' سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد و عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا جیسے مصریوں' یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔ اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف سٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی' نہ انفرادی نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتہ" انسانی ہے اور اس کا مقصد' باوجود تمام فطری امتیازات کے' عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر مبنا نہیں کیا جا سکتا' نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومی نے:

ہم ولی از ہم زبانی بہتر است!

اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہو گی اور شرف انسانیت کے خلاف ہو گی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان

کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسا اساس نہ بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے ان کے اساس انتخاب کا؟ لوتھر کی اصلاح، غیر سلیم عقلیت کا دور، اصول دین کا سٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں؟ لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف!

(حسین احمد مدنی کے جواب میں۔۔ مضمون متعلقہ وطنیت)

نبوت محمدیہ ﷺ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ ﷺ کی بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقام محمدی ﷺ، یہ ہے نصب العین ملت اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے تک، معلوم نہیں، حضرت انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوام عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے ان کو ایک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے، وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین جانئے کہ دین اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالم انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلم عظیم ہے۔ بنی نوع انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

(حسین احمد مدنی کے جواب میں -- مضمون متعلقہ وطنیت)

عالمگیر پیغام کیلئے بھی ایک سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ لیکن باعتبار اطلاق و انطباق مخصوص و محدود، ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اگر اسے موثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولیں نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتی ہو۔ لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب--- متعلقہ "فلسفہ سخت کوشی")

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوت طلب و جستجو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ

ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید' ذات پات' رتبہ و درجہ' رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے آثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسن معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گرانمایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیض صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔۔ متعلقہ "فلسفہ سخت کوشی")

مذہب نجی معاملہ نہیں۔

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے؟ اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں' لیکن اس کے نظام سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں' اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جمالی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کے واردات مذہب کی حیثیت' جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے' اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق محض صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو۔ لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولیں نتیجہ سے ایک ایسے نظام سیادت کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہٰذا اس کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔

(خطبہ صدارت مسلم لیگ 1930ء)

یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں' بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جز کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ (ایضاً)

اسلام اپنے اصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔

اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں' بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہونا معقول و مردود ہے۔

(بجواب حسین احمد مدنی۔۔ متعلقہ "قومیت")

امت مسلمہ جس دین فطرت کی حامل ہے اس کا نام دین قیم ہے۔ دین قیم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوم ہے' اس گروہ کے امور معاشی اور معادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظ دیگر یہ قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم' دین اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہونا معقول و مردود ہے۔ (ایضاً")

ملائیت' تصوف' ملوکیت

1- ملائیت :- علماء ہمیشہ اسلام کے لئے ایک قوت عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں۔ لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوال بغداد کے زمانے سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے اور آزادی اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین کے لئے حوصلہ افروز تھی' درحقیقت ایک بغاوت تھی علماء کے اسی جمود کے خلاف۔ پس انیسویں صدی کے معلمین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربے کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

2- تصوف :- مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں' جس نے عوام کی قوت عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوف اپنے اس اعلیٰ مرتبہ سے جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا' نیچے گر کر عوام کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوت ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصر جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی روح سے آشنا ہو جائیں جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

3- ملوکیت :- مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصد خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان

حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

(ختم نبوت ----- بجواب پنڈت جواہر لال نہرو)

پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ ڈالے گی۔

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن وامان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں' اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن' شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔ (ایضاً)

کمیونزم خلاف اسلام ہے۔

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تاریخ سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا' جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم' سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے' جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

(مکتوب بنام غلام السیدین۔ محررہ 17 اکتوبر۔ 1936ء)

یہی اسلام کی منزہ شکل ہے۔

لیگ کو آخرالامر یہ طے کرنا ہو گا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی' عوام کے لئے کبھی جاذب نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئین جدید (یعنی 1935ء کے آئین) کے مطابق' اعلیٰ ملازمتیں' امراء کے بیٹوں کے حصہ میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہو گا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔

اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دور حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (Development) دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامان پرورش (Subsistance) ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت۔۔۔ (Social Democracy) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہو گا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہو گا کہ ہم اسلام کو پھر سے منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔

(مکتوب بنام قائداعظم محمد علی جناحؒ۔ مورخہ 28 مئی 1937ء)

تحریک ترویج اردو

پہلا خصوصی اجلاس 9/10/98 بمقام اقبال میونسپل لائبریری، مری

زیر صدارت: ڈاکٹر رخشندہ رضا پرنسپل گورنمنٹ گرلز کالج، مری

مہمان خصوصی: جناب رضا احمد اسسٹنٹ کمشنر، مری

عالمی اسلامی اسپرانتو ایسوسی ایشن لوئر مال مری کے تحت اس اجلاس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دعوت نامہ مجھے بھی ملا اور شرکت کی جناب پروفیسر علامہ مظفر عباسی۔ جناب لطیف کاشمیری۔ جناب احمد زمان لون اور جناب یوسف جمیل کے علاوہ صدر مجلس صاحبہ اور مہمان خصوصی اور امجد مت صاحب نے بھی خطاب فرمایا۔ جس میں زبان اور تہذیب وتمدن کے تعلق کو واضح کیا گیا اور ترویج اردو کے سلسلہ میں دفتر، بینک، ڈاکخانہ اور عدالت کی طرف سے انگریزی برتری کو کم کرنے کی تجاویز پر غور کیا گیا تاکہ اردو کو رائج کر کے کم تعلیم یافتہ اور اہل دیہات کی مشکلات کو کم کیا جا سکے میں نے تجویز دی کہ پروگرام کے مطابق جہاں 73ء کے آئین کے مطابق اردو کو صحیح قومی زبان کا درجہ دلانے کی کوشش کی جائے وہاں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی مجوزہ "اردو یونیورسٹی" کے لئے بھی کام کیا جائے۔ احباب سے توقع ہے کہ وہ تحریک ترویج اردو کے لئے پاکستان بھر میں کام کریں گے۔

تعاون :

1- عالمی اسلامی اسپرانتو ایسوسی ایشن لوئر مال، مری

2- پنجاب ٹیچرز یونین۔

والسلام

ملک حنیف وجدانی

صدر رباقبان ایسوسی ایشن

معرفت P.O موہڑہ ویسدال مری

پوسٹ کوڈ نمبر 47224

تصوّف

کو اصلِ دین اور مغزِ قرآن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ تصوف کی حقیقت کیا ہے۔ اس کی تاریخ کیا اور اسلام کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے۔

پرویزؒ صاحب نے (جن کی آدھی زندگی تصوف کی وادیوں میں گزری ہے) پہلی بار ان حقائق سے پردہ اٹھایا ہے اور اپنی تصنیف ——

تصوّف کی حقیقت

میں کتاب اللہ اور ممتاز صوفیائے کرام کی تصانیف کی روشنی میں بتایا ہے کہ اسلام کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے!

کتاب کے دوسرے حصے کا موضوع

اقبالؒ اور تصوّف

قیمت: سٹوڈنٹ ایڈیشن =/120 اعلیٰ ایڈیشن =/240

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

اسلامی مملکت کا تصور

(اقبالؒ کے نزدیک)

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را — بجنباں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند — کہ ملا کم شناسد رمزِ دیں را

دین کی تاریخ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم، بصیرت افروز حقیقت بیان کی ہے جب کہا کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (22:52)۔ "اے رسول ﷺ! تجھ سے پیشتر کوئی صاحب وحی ایسا نہیں ہوا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ (اس کی وفات کے بعد) دین کے مخالفین نے اس کی وحی میں آمیزش نہ کر دی ہو۔ اس کے بعد خدا ایک اور نبی بھیج دیتا اور اس کی طرف وحی کے ذریعے اس آمیزش کو زائل کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا صاحب حکمت ہے"۔ رسول... کی وحی میں آمیزش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خدا کا دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ دین نام تھا احکام و اقدار خداوندی کو معاشرہ میں قانونی حیثیت سے نافذ کرنے کا۔ اس کے برعکس، مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق تھا جو بندگی، پرستش، یا مختلف رسوم کی رو سے انفرادی طور قائم ہو جاتا تھا۔ دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابتداء میں دین ہی تھے۔ (قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے ہر قوم میں رسول بھیجے تھے۔) مفاد پرست گروہوں نے جن کے سرکردہ مذہبی پیشوا تھے، انہیں مذہب میں تبدیل کر دیا۔ ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ:

يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۤ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ (2:79)۔ یہ خود شریعت وضع کرتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ شریعت خداوندی ہے۔ اور ایسا کچھ پیسے کمانے کے لئے کرتے تھے۔ مذہب ان کا پیشہ بن جاتا تھا۔

خدا نے رسول اللہ ﷺ کی طرف جو دین بھیجا اس کے متعلق کہہ دیا کہ:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ..... (6:116)۔ خدا نے اس وحی کی رو سے اپنے قوانین کو عدل و صداقت کی بنیادوں پر مکمل کر دیا ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔ اس لئے کہ:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9)۔ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد وحی کی ضرورت نہ تھی، اس لئے یہ ختمِ نبوت کا اعلان تھا۔ کلام اللہ کے مکمل، غیر

متبدل اور محفوظ ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ انسانوں کے ساتھ خدا کے مزید کلام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب خدا کے بندوں کے ساتھ کلام کرنے کا ذریعہ اس کا یہی کلام (قرآن مجید) ہو گا۔

اسلام مذہب بن گیا

لیکن جو کچھ دین کے ساتھ اس سے پہلے ہوتا رہا وہی کچھ اس دین کے ساتھ بھی ہوا جو قرآن میں دیا گیا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کیا قرآن محفوظ نہ رہا؟ کیا اس میں بھی آمیزش ہو گئی؟ اگر ایسا ہو گیا تو خدا کی اس ذمہ داری کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اس نے اسے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے اوپر لی تھی؟ نہیں! ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کا متن تو بالکل محفوظ رہا۔ اس میں نہ ذرا سا تغیر و تبدل ہوا' نہ کسی قسم کی آمیزش!---- لیکن ہوا.... یہ کہ خارج از قرآن متعدد عناصر کو وحی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا اور خارج از قرآن عناصر نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اب جو کچھ اسلام کے نام سے دنیا میں متعارف ہے وہ دین نہیں بلکہ یہی مذہب ہے۔ دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کی سب سے پہلی محسوس علامت یہ ہوتی ہے کہ امت میں وحدت نہیں رہتی۔ وہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے' اور ہر فرقہ کی شریعت کی آخری سند (خدا کے بجائے) کوئی نہ کوئی شخصیت قرار پا جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (30:31)-

استحکامِ آیات اللہ کا عملی طریق

(جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) جب دین' مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا تو خدا ایک اور نبی بھیج دیتا تھا جو وحی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیتا تھا۔ لیکن ختم نبوت کے بعد' نبیوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اسے جاری رکھنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد' خدا کی وحی (قرآن مجید) میں آمیزش نہیں ہو سکتی تھی جسے الگ کرنے کے لئے نبی کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ خدا کی آیات (قرآنی قوانین) اپنی منزہ شکل میں موجود تھیں۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ ان آیات کو (قرآنی الفاظ میں) "محکم" کیا جائے۔ (ثم یحکم اللہ اٰیاتہ) آیات قرآنی کو محکم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں دین کی اساس قرار دیا جائے۔ انہیں حق و باطل' جائز و ناجائز' صحیح اور غلط کا معیار تسلیم کیا جائے۔ لیکن یہ فریضہ انفرادی طور پر سرانجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ امت کا اجتماعی فریضہ تھا۔ جس کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس کا جملہ کاروبار' قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ کتب سماوی کے نزول کا مقصد یہی تھا۔ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (2:213)- کہ لوگوں کے اختلافی امور میں ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ فاحکم بینھم بما انزل اللّٰہ (5:48)- تم لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔ اس امت سے بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42:10)- اگر کسی معاملہ میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب کی رو سے کر لیا کرو۔ حتیٰ کہ حتمی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ:-

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ○ (5:44)- جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا' آیات اللہ کو محکم کرنے کے لئے خدا کی طرف سے کسی کے آنے کی ضرورت نہیں تھی (خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے)۔ اس فریضہ کو امت نے خود سرانجام دینا تھا۔ یعنی خارج از قرآن عناصر کو شریعت

خداوندی قرار دینے کے بجائے' کتاب اللہ کو مملکت کا ضابطہ نظام قرار دینا' امت کا فریضہ تھا۔ اس کے لئے کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں تھی۔ خدا کی طرف سے جس نے آنا تھا وہ آخری مرتبہ آکر اور خدا کی مکمل و محفوظ کتاب دے کر چلا گیا تھا۔ (علیہ التحیۃ والسلام)

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں' اسلام' صدیوں سے دین کے بجائے مذہب بن چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ امت کو بتایا جائے کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو' وہ دین خداوندی نہیں۔ اسلام اسی صورت میں "الدین" کی شکل اختیار کر سکے گا جب اپنی ایک آزاد مملکت ہو اور اس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ ہمارا زمانہ اس اعتبار سے انتہائی خوش بخت ہے کہ اس میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا ہوا جس نے اس فراموش کردہ عظیم حقیقت کو امت کے سامنے پیش کیا۔ یہ تھے حکیم الامت' علامہ اقبال ؒ۔ اقبالؒ نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مامور من اللہ ہیں' یا انہیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ ایسا دعویٰ ختم نبوت کے منافی اور یکسر باطل تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ قرآن کریم پر غور و تدبر اور اسوۂ رسول اللہ ﷺ کے گہرے مطالعہ سے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہے جسے وہ اپنی بصیرت کے مطابق قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آپ ان کے کلام کو شروع سے اخیر تک دیکھ جایئے' اس میں روش روش پر آپ کو عظمت قرآنی کے پھول کھلے دکھائی دیں گے۔ ان کا پیام' قرآنی حقائق ہی کی تشریح و توضیح ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب سابقہ انبیاء کرامؑ دین کو اس کی حقیقی شکل میں پیش کرتے تھے تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے دینی مملکت کا تصور پیش کیا اور قائداعظمؒ نے اس تصور کی عملی تشکیل کے لئے تحریک پاکستان کا آغاز کیا۔ نیشنلسٹ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت لازمی تھی کیونکہ ان کے پیش نظر تو اسلام کا وہی تصور تھا جس میں اعتقادات' عبادات' اور شخصی قوانین کی آزادی ہو اور پبلک لاز' مغرب کے جمہوری انداز سے وضع کئے جائیں۔ ان کا اسلام کے متعلق یہی تصور تھا جس پر' جامع انداز میں تنقید کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ :۔

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام تو اسی صورت میں آزاد ہو سکتا ہے کہ جملہ قوانین مملکت' کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے متعین کئے جائیں اور یہ' اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلامی نظام کا یہ تصور' امت کی نگاہوں سے صدیوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کیلئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ :۔

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است
رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

قرآن کا نصب العین' اس کی منزل' اس کا منتہیٰ' اس کا مقصود کچھ اور ہے اور مسلمانوں کا اسلام کا تصور' ان کے رسوم و مناسک' ان کا شعار زندگی' ان کا آئین حیات کچھ اور۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں :۔

بندۂ مومن ز قرآں بر نخورد
در ایاغِ او نہ مے دیدم' نہ دُرد

اصل یہ ہے کہ امت مسلمہ نے قرآن کریم کے نخل حیات کا پھل کھایا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس کے ساغر زندگی میں' قرآن کی شراب طہور تو ایک طرف' اس کا تہ جرعہ تک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ حقیقت انتہائی تعجب انگیز اور حیرت افزا نہیں کہ :۔

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

وہ قوم جس نے قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کو نیست و نابود کر

دیا' اس کے بعد' وہ خود تختِ ملوکیت بچھا کر اس پر مسند نشین ہو گئی۔ اور پھر: ۔

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت
دین او نقش از ملوکیت گرفت

جب نظامِ ملوکیت محکم ہو گیا تو دین' تمام تر اسی کے رنگ میں رنگا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ--- آفریدی شرع و آئینے دگر---- اسلام کی جگہ ایک مذہب' ایک نئی شریعت وجود میں آگئے۔ اب اس کا علاج یہ ہے کہ---- اند کے با نورِ قرآں در نگر۔

یہی تھا وہ "نورِ قرآن" جس کی روشنی میں علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی تصورات نہایت واضح الفاظ میں پیش کئے۔ آج کی نشست میں' میں اس کے مختصر سے خط و خال آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس ضمن میں' ان کے سات لیکچروں کے مجموعہ میں سے چھٹا خطبہ' اور 1930ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کا خطبہ صدارت' خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں' میری یہ تصریحات بیشتر انہی کے اقتباسات پر مشتمل ہیں۔

الٰہ آباد کا خطبۂ صدارت

آپ نے 1930ء کے خطبہ صدارت کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

"آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے' اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو انسانی نگاہ کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذن بال کشائی دے گا۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دین' انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین قوت کا حامل ہے اور جسے اس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیرِ الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی' اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں ہو گی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویہ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز نہ خیال فرمایئے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ کوئی نظری مسئلہ ہے۔ نہیں۔ یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفس اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ حیات و عمل کے اثر انداز ہو گا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے۔"

اس تمہید کے بعد انہوں نے' مذہب اور دین کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا۔ فرمایا:

"حقیقت یہ ہے کہ اسلام' خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئت ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابگل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطہ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ وہ ایک فعال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔"

اس نظری بحث کے بعد وہ اس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:

"ہندوستان دنیا بھر میں بہت بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانان ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں' کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے' (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخرالامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔"

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"تنہا ایک ملک میں سات کروڑ (اس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی ہی تعداد تھی) فرزندان توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملت اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہو گا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطہ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالم اسلام پر کیا اثر ہو گا۔"

ان کی بصیرت نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

"مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔

سچ کہا تھا اس دیدہ ور نے کہ:۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ:

پاکستان کا ہیولیٰ

میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے.... مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اس مملکت کے قیام سے ہو گا کیا؟ فرمایا کہ:

"اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں' اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن' شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔"

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے خطبات تشکیل جدید (کے چھٹے خطبہ) میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں' ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

اندریں حالات ہمارے لئے کشاد کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینہ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں' اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے' انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے' اور حریت' سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سر نو زندہ کر کے' ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی' عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیل جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے مملکت پاکستان کا جو نظریہ اور تصور پیش کیا تھا اس کی غرض و غایت اور منتہا و مقصود کیا تھا؟ انہوں نے یہ تصور 1930ء میں پیش کیا تھا۔ (اگرچہ خطبات تشکیل جدید اس سے بھی دو سال پہلے دیئے گئے تھے۔) حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کا سارا کلام اور پیام انہی تصورات کی توضیح و تشریح ہے۔

اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک' واحد اور غیر منقسم امت ہوتی ہے جو دین کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں نہ مذہبی فرقے ہوتے ہیں' نہ سیاسی پارٹیاں۔ اس مملکت یا امت کا ایک ضابطہ قوانین ہوتا ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تمیز و تفریق ہوتی ہے' اور نہ ہی کوئی گروہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی الگ فقہ کی پیروی کرے گا۔ ایک مملکت کے اندر الگ الگ ضوابط قانون کی پیروی تو مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہوتی ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

واحد ضابطہ قوانین

لیکن جس مملکت کی تشکیل کا نظریہ علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا' ظاہر ہے (اور انہیں اس کا علم تھا) کہ اس میں مسلمانوں کے متعدد فرقے ہوں گے۔ سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطہ قوانین مرتب کس طرح ہو سکے گا جس کا اتباع تمام مسلمان یکساں طور پر کریں؟ سیکولر حکومت میں تو یہ مسئلہ بڑا آسان ہوتا ہے۔ اس میں مختلف مذاہب یا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے پیروؤں کو' اپنے اپنے پرسنل لاز کی آزادی ہوتی ہے اور مملکت کے پبلک لاز کے وضع کرنے میں کسی مذہب کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت تو سیکولر نہیں ہوتی۔ اس میں اس قسم کی تفریق کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ بنظر غائر دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان کے نیشنلسٹ علماء کے سرخیل (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ کے درمیان مشہور معرکہ مملکت کے اسی (دو جداگانہ تصورات کا پیدا کردہ تھا۔ نیشنلسٹ علماء سیکولر حکومت کے موید تھے اور علامہ اقبالؒ اسے اسلام کے یکسر خلاف قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک' مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کو خلاف اسلام سمجھتے تھے۔ ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آگئی ہو گی کہ علامہ اقبالؒ نے جب اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا تو ان کے سامنے بنیادی اور اہم ترین سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطہ قوانین کس طرح مرتب ہو گا جس میں پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق نہیں ہو گی اور جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو گا۔ انہوں نے اپنے خطبات تشکیل جدید کے چھٹے خطبہ میں اس نہایت اہم اور نازک ترین مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں اس خطبہ کے ضروری اقتباسات پیش خدمت ناظرین کرنا چاہتا ہوں۔

نفسیاتی تغیر شرط اوّل

لیکن کسی مملکت میں قرآنی قوانین و احکام کو میکانکی طور پر نافذ کر دینے سے وہ مملکت اسلامی نہیں بن جاتی۔ مملکت کے اسلامی بننے کی اولین شرط یہ ہے کہ اس کے افراد میں حکمت قرآنی کے مطابق نفسیاتی تبدیلی واقع ہو۔ ان کے قلب و دماغ میں قرآنی خطوط پر تغیر رونما ہو۔ یہ شرط خود قرآن مجید کی عائد کردہ ہے جب وہ کہتا ہے کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11)۔ کسی قوم کی حالت کو' کوئی اور تو ایک طرف' خود خدا بھی نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے اندر' نفسیاتی تغیر نہ پیدا کر لے۔ علامہ اقبالؒ کا سارا پیغام' اسی تغیر نفس کی شرح ہے جسے وہ تعمیر و استحکام خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ وہ (جاوید نامہ میں) کہتے ہیں کہ: ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست' چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

"چو آں بجاں در رفت" سے مراد، قرآنی حکمت کے مطابق نفسیاتی تبدیلی ہے۔ خارجی تبدیلی اسی داخلی تبدیلی کے مطابق رونما ہوتی ہے۔ اسی کو وہ فاش تر الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ :۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کُشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف
(بال جبریل)

انسانی ضمیر پر "نزول کتاب" سے مراد بھی، قرآن کے مطابق تغیر نفس ہے۔ یہ مقصد، قرآنی حقائق کو اس طرح تعلیم و تربیت کی بنیاد بنا دینے سے حاصل ہو سکتا ہے کہ اس سے افراد ملت کا قلب و دماغ قرآنی سانچے میں ڈھل جائے۔ اسی لئے وہ قرآن کے متعلق کہتے ہیں کہ ۔

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

وہ تجھے ویسا انسان بنا دیتا ہے جیسا انسان خدا چاہتا ہے۔ اور یہ مقصد احکام قرآنیہ کو میکانکی طور پر نافذ کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ ۔

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

یہ بات قانون سازوں کے بس کی نہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ مقصد قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز نبوت ہی سے حضورؐ نبی اکرم کا فریضہ--- **یعلمھم الکتاب و الحکمۃ ویزکیھم** قرار دے دیا گیا تھا۔ یعنی آپؐ، کتاب و حکمت کی تعلیم سے ان کی تعمیر خودی کرتے تھے۔ تشکیل مملکت کا مرحلہ تو اس سے کہیں بعد جا کر آیا تھا۔ اور قرآنی مملکت قائم بھی انہی افراد کے ہاتھوں ہو سکتی تھی جن میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر پیدا ہو چکا ہو۔ حضورؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی اسی پروگرام کی پہلی کڑی تھی۔

لیکن مملکت کا کاروبار تو بہرحال قوانین کی رو ہی سے چلتا ہے اس لئے اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور علامہ اقبالؒ نے بڑی شرح و بسط سے اس پر گفتگو کی ہے۔ اصولی طور پر وہ بااصرار و تکرار اس حقیقت کو دھرائے جاتے ہیں کہ اسلامی مملکت کے آئین و قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہو گا۔ وہ اپنی پہلی مثنوی (اسرار و رموز) میں کہتے ہیں کہ : ۔

ہیچ می دانی کہ آئینِ تو چیست
زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لا یزال است و قدیم

قرآن کا انداز

لیکن قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) اصول اور حدود متعین کر دیئے ہیں اور جزوی اور تفصیلی قوانین خود ہی مقرر نہیں کر دیئے۔ اسے اس کتاب کی وارث امت (یعنی ان کی مملکت) پر چھوڑا ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، تفصیلی قوانین خود وضع کرے۔ یہ حدود و اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر وضع کردہ قوانین میں، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق، تبدیلی کی جا سکے گی۔

جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لئے ابدی اور غیر متبدل ضابطہ راہ نمائی قرار پانا ہو، اسے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا یہ وہ بنیادی نکتہ ہے، جسے علامہ اقبالؒ نے بڑی شد و مد سے دہرایا ہے۔ وہ خطبات تشکیل جدید (کے چھٹے خطبے میں) کہتے ہیں :

ثبات و تغیر کا امتزاج

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ

کے متعلق اس قسم کے تصور پر مشتمل ہو' اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس' اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے' ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے---- تو اس سے زندگی' جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے' یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس' گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصول حرکت کار فرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہاد مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سنی حضرات' نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے' ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظام شریعت میں' جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے' اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانون شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا"۔

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ میں ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں:

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس' ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہنمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے' قانون شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہین منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود' یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی

اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہاد مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں' اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکر انسانی کی نشوو ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں' اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی' کامل' مختتم اور سہو و خطا سے مبرّیٰ سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دور حاضر کے اعتدال پسند مسلمان' زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں' فقہ کے اصول اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرز عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے' اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ :

قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا' جیسا کہ دور حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ :

"تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں' ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔"

تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے' اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں :

اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا' اسلام کے خلاف افترئ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دور حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں :

"اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں' اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں' تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس' تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا۔)"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابل تغیر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں از بس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ:

"بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔"

لیکن انہوں نے کہا کہ:

"بایں ہمہ، میں مسئلہ زیر نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔ سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قرن اول سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔"

علامہ اقبالؒ کی یہی جسارت تھی جس کی وجہ سے وہ ارباب دانش کی نگاہوں میں اس قدر واجب التکریم و تحریم بن گئے تھے۔ خود انہی کے الفاظ میں:

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاء حضرات کی طرف ہوتی ہے، لیکن جب بات ان ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جرات کا متقاضی ہے۔ مبداء فیض کی یہ انتہائی کرم گستری تھی کہ اس نے علامہ اقبالؒ کو اس قسم کی جرات و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں:

احادیث کی قانونی حیثیت

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ ﷺ نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ ﷺ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع

انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام' اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی' انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطہ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوین فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں' تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے' جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں' میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے' امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرز عمل کے ہم آہنگ ہو گا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

احادیث کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرز عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید' قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضور نبی اکرم ﷺ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے' بذریعہ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ ان کے متعلق حضور ﷺ کو حکم خداوندی تھا کہ :

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (3:157)- ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو۔

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں' وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا۔' اور حضورؐ کے بعد جماعت مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ :

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (42:38)- یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔

یہ طریق عمل دور خلافت راشدہ میں جاری رہا۔ اس وقت تک یہ بات کسی کے حیطہ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصور خلافت راشدہ کے باقی نہ رہنے کے بعد پیدا ہوا۔

احادیث رسول اللہ ﷺ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصور امام مالکؒ اور ان سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا۔۔۔ اس مسلک پر امام ابو حنیفہؒ نے کڑی تنقید کی اور قیاس کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رو سے اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔۔۔ علامہ اقبالؒ ان کی اس

نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :

"انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہد رسالتمآبؐ اور عہد صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا' اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس' ان کی سخت تنقیدیں مذہب حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصول قانون سازی کی تعبیر میں' زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا مکتب فقہ' جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا' اپنے خاص الخاص اصول فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ و تشریع کے مقابلہ میں' حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے"۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :

"لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے' خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف' امام ابو حنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے' بعینہ اسی طرح جس طرح امام ابو حنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہد رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔"

ان تصریحات سے' عزیزان من ! یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل' قرآنی احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے' یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے' ان میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہو گی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ :

روحِ عمرؓ

وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (ترکی کے) اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے۔۔۔۔ سامنے آنے والا ہے' یہ ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرات نصیب ہوئی کہ :

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں :

"اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے' اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دور حاضر کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے

معاشرہ کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالم گیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔"

ان کے نزدیک اس سوال کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ انہوں نے اپنے خطبات سے بھی پہلے' امرتسر کے حلقہ اہل قرآن کے متعلق ذکر کرتے ہوئے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ :

"ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً" تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں' یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

انہوں نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں بھی اس اہمیت کو دہراتے ہوئے لکھا کہ :

"قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیاسیات انسانیہ کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔

(طلوع اسلام۔ اپریل 1970ء - ص 5)

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسی پیغام کو عام کرتے رہے۔ اور ان کی وفات کے بعد' اس پیغام خداوندی کی نشرواشاعت کی سعادت اس ہیچ میرز کے حصہ میں آئی۔ اقبالؒ کی زندگی میں اس مسئلہ کی حیثیت ہنوز نظری تھی۔ یعنی انہوں نے اسلامی مملکت کا یہ نظریہ تو پیش کر دیا تھا لیکن اس مملکت کے وجود میں آنے کا (بظاہر) کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا' اس لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے ان خیالات و تصورات کو نہ کوئی خاص اہمیت دی گئی اور نہ ہی ان کی خصوصیت سے مخالفت کی گئی۔ لیکن اب جبکہ یہ مملکت وجود میں آچکی ہے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قانون سازی کے اس تصور کی بڑی شدت سے مخالفت ہو رہی ہے۔ میرے خلاف ایک ہزار "علماء" کا کفر کا فتویٰ اس مخالفت کی زندہ شہادت ہے۔ لیکن قرآن مجید تو ایک ابدی حقیقت ہے۔ اس کا سر رشتہ نہ علامہ اقبالؒ کی طبعی عمر سے وابستہ تھا' جو ان کی وفات سے یہ ٹوٹ جاتا۔ نہ ہی یہ میری زندگی تک محدود ہے' اور نہ ہی اسے مخالفین کی کاوشیں اور کوششیں ناکام بنا سکتی ہیں۔ اسے دنیا کے ہر

نظام پر غالب آ کر رہنا ہے کہ: لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ اس خدا کا فیصلہ ہے جس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ لہٰذا ایسا بالآخر ہو کر رہے گا۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:33)۔ اور قوانین خداوندی کے ساتھ دیگر قوانین ملانے والوں کی تمام کوششوں کے علی الرغم ایسا ہو گا۔

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے' مناسب سمجھتا ہوں کہ آخر میں اسے مختصر الفاظ میں سمٹا کر آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

1- حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے ایک ضابطہ قوانین و آئین عطا ہوتا تھا۔ جو قوم اس ضابطہ کی صداقت کو تسلیم کر لیتی تھی اس کا فریضہ ہوتا تھا کہ وہ اسے عملاً نافذ کرے۔ چونکہ یہ پوری قوم ایک ضابطہ کے تابع زندگی بسر کرتی تھی اس لئے اس میں کسی قسم کے اختلاف اور تفرقہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

2- رسول کے چلے جانے کے بعد' وہ قوم اس ضابطہ میں آمیزشیں کر دیتی تھی اور اس طرح ان میں اختلافات نمودار ہو جاتے تھے۔ اس طرح وہ دین مذہب بن جاتا تھا۔ یہ جو دنیا میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں' یوں سمجھئے کہ یہ دین میں پیدا شدہ مختلف فرقے ہیں کیونکہ دین تو شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ دین کی اطاعت کرنے والوں میں فرقے پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔

3- یہ دین آخری مرتبہ' مکمل اور غیر متبدل شکل میں نبی اکرمؐ کی وساطت سے ملا۔ جن سعادت مند افراد نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا وہ ایک قوم (یا امت) بن گئے۔ اس امت نے' اس دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک مملکت کی تشکیل کی جس کا ضابطہ آئین قرآن کریم تھا۔ اس مملکت کی مرکزی اتھارٹی امت کے مشورہ سے اس دین پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرتی اور انہیں قوانین مملکت کی' حیثیت سے نافذ کرتی۔ ان کا اطلاق تمام امت پر یکساں طور پر ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں' امت میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ مختلف فرقوں کے معنی تو یہ تھے کہ مختلف گروہ' مملکت کی طرف سے نافذ کردہ قوانین کے بجائے' اپنے اپنے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرتے۔ ایک مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس قسم کا طرز عمل تو مملکت سے بغاوت کے مرادف ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ (30:31)۔ یعنی ایک اتھارٹی (حکومت قرآنی) کی اطاعت کرنے کے بجائے' مختلف اتھارٹیز کی اطاعت کرنا۔ رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ جو لوگ فرقے پیدا کر لیں تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ (6:160)۔ یعنی جو مملکت اسلامیہ کی مرکزی حیثیت ہی کو تسلیم نہ کریں' ان کا اس مرکز سے تعلق کیا؟ وہ تو اس کے باغی قرار پاتے ہیں۔ چونکہ مرکز ملت کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے تھے' اور فرقوں میں فیصلے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوتے ہیں' اس لئے کہہ دیا کہ جو لوگ۔۔ مَاانزل اللّٰہ۔ (قرآن مجید) کی رو سے فیصلے نہیں کرتے انہیں مومن نہیں کہا جا سکتا۔ (5:44)۔

4- ہمارے ساتھ ہوا یہ ہے کہ امت کی مرکزی اتھارٹی (حکومت خداوندی یا خلافت علیٰ منہاج رسالت) کے باقی نہ رہنے سے دین' مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے' اس لئے اس میں مختلف فرقے پیدا ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان فرقوں کو باقی رکھتے ہوئے اسلامی نظام (یعنی دین خداوندی) قائم ہو سکتا ہے تو وہ یا تو دین اور مذہب میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور یا پھر امت کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرقوں کی موجودگی میں دین کا نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ دین کا نظام قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے' اور وہ یہ کہ ایک ایسی مملکت کا قیام عمل میں آئے جو قرآنی اصولوں کو مملکت کا آئین قرار

دے۔ امت کے مشورہ سے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرے۔ انہیں قوانین حکومت کی حیثیت سے تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ کرے۔۔۔ اس میں نہ اس فرقے یا اس فرقے کی کوئی تمیز ہو اور نہ ہی پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق۔۔۔ اس طرح ایک خدا۔۔ ایک ضابطہ قوانین اور ایک امت کی تشکیل سے' دین کا نظام قائم ہو گا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو احیاء اسلام کی ہر کوشش رائیگاں جائے گی۔

یہ تھی خلافت راشدہ کے بعد اسلامی مملکت کے قیام کی وہ ممکن العمل شکل جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اور جس کے مطابق ایک خطہ زمین کے حصول کے لئے قائداعظمؒ' تحریک پاکستان کو وجود میں لائے وہ علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ بنیادی اصول کو کس طرح واضح طور پر سمجھ چکے تھے' اس کی تفاصیل میں اپنے اس خطاب میں پیش کر چکا ہوں جسے میں نے سابقہ یوم پاکستان (مارچ 1977ء) کی تقریب پر پیش کیا تھا۔ (وہ الگ شائع ہو چکا ہے) انہوں نے ان تمام تفاصیل کو ان چار لفظوں میں جامع طور پر سمیٹ کر رکھ دیا تھا کہ:

"قرآن کریم کے احکام ہی ہماری سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔"

یہ وہ حدود ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں' اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے' ملت اسلامیہ اپنی مملکت کے لئے قوانین و ضوابط وضع کرتی ہے جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مملکت وجود میں نہیں آسکتی' اور اگر وجود میں آجائے تو مستحکم نہیں رہ سکتی' جب تک اس میں ایک (واحد) ضابطہ قوانین نافذ نہ ہو۔ جس مملکت میں مختلف گروہ اپنے لئے الگ الگ قوانین و ضوابط وضع کر لیں' اس میں انارکی پھیل جاتی ہے۔ سیکولر اسٹیٹ میں قانون سازی کا مسئلہ آسان ہوتا ہے۔ اس میں مختلف مذہبی گروہوں کو ان کے اپنے شخصی قوانین پر عمل پیرا ہونے کی آزادی دے دی جاتی ہے اور پبلک لاز کا ضابطہ' بلا تمیز مذاہب' آزادانہ وضع کر لیا جاتا ہے جس کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں نہ تو پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے پبلک لاز بلا حدود و قیود جس طرح جی چاہے وضع کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سب قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے وضع کئے جاتے ہیں۔

لیکن اس وقت صورت یہ ہے کہ مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر فرد اپنی اپنی فقہ پر شدت سے جما بیٹھا ہے۔ ان کی فقہ کا دائرہ' شخصی قوانین تک محدود ہے۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں' انہیں شخصی قوانین کی آزادی تھی اور پبلک لاز سیکولر انداز سے وضع ہوتے تھے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت اس پر مطمئن تھی۔ جسے ہندوستان کی تحریک آزادی کہا جاتا ہے' اس سے مراد انگریزوں کی جگہ' اہل ہندوستان کی اپنی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس تحریک میں' وہاں کی اکثریت' ہندوؤں نے' اس امر کی ضمانت دیدی تھی کہ حصول آزادی کے بعد' قوانین مملکت کی شکل وہی رہے گی جو انگریزی عملداری میں رائج تھی۔۔۔ یعنی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے شخصی قوانین اپنے اپنے ہوں گے' اور ملک کے پبلک لاز سیکولر انداز سے وضع ہوں گے۔ وہاں کے علماء کی اکثریت کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے تھا۔ وہ جس طرح انگریزی عمل داری میں اس نہج حکومت سے مطمئن تھے اور اسے قطعاً اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے' اسی طرح وہ ہندوؤں کے پیش کردہ نہج حکومت کو اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے اس لئے وہ اس تحریک میں بہ ہیئتِ مجموعی شامل تھے۔ اصل یہ ہے کہ فرقہ وارانہ گروہ بندی میں ہر فرقہ کے نزدیک اس کے اپنے معتقدات' مسالک' رسوم' اور شخصی قوانین کا نام اسلام ہے۔ اگر اسے ان کا تحفظ حاصل ہو جائے تو وہ

مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسلام محفوظ ہے۔ اور اگر اس پر کوئی زد پڑتی ہو تو وہ چلا اٹھتا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ اس سے زیادہ اسلام کا کوئی تصور ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ یہ شکل سیکولر نظام حکومت ہی میں قائم رہ سکتی ہے۔ اس کے برعکس' اسلامی نظام مملکت میں فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس میں (واحد) امت مسلمہ ہوتی ہے جو ایک ہی ضابطہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ فرقہ بندی کو اسلام قرار دینے اور اس پر مطمئن ہو جانے والے علماء سیکولر انداز حکومت ہی کے موید ہو سکتے ہیں---------- یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ ہندوستان کے نیشنلسٹ اخبار مدینہ (بجنور) کی 17 اپریل 1963ء کی اشاعت میں' مولانا اسرار احمد آزاد (دیو بندی) کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:

"یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیو بند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔"

انہی علماء کے سرخیل' (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے جن کا مسلک یہ تھا کہ:

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی' سب شامل ہوں حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصولوں کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔

(زمزم۔ مورخہ 7 جولائی 1938ء)

اس کے برعکس' قائداعظمؒ' علامہ اقبالؒ کے تصور کے مطابق اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے مصروف جدوجہد تھے۔ ظاہر ہے کہ "علماء" کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت فطری امر تھی۔ یہ ان کے "تصور اسلام" کے خلاف تھی۔ یہ تھی ہندوستان میں' تحریک پاکستان اور علماء کے درمیان کھلی ہوئی جنگ کی حقیقی وجہ۔ پاکستان وجود میں آگیا اور علماء کا یہ گروہ ادھر آگیا۔

------ یہاں بھی ان کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصور کی اسلامی حکومت قائم نہ ہونے پائے کیونکہ اس سے ان کے فرقہ وارانہ اسلام کی اجارہ داری باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ یہ حضرات ہر فرقہ کے پرسنل لاز کی آزادی کا چرچا تو ہر جگہ کرتے ہیں لیکن پبلک لاز کے ضابطہ کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ یہ یہاں اسی انداز کی سیکولر حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے داعی (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اور ان کے ہمنوا حضرات تھے۔ اس قسم کی حکومت میں اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو' تو یہ اسے اسلامی حکومت قرار دیں گے۔ اگر اقتدار کسی اور کے ہاتھ میں ہو تو وہ غیر اسلامی حکومت ہو گی۔

ان کے علاوہ تحریک پاکستان----- کے خلاف ایک اور عنصر بھی کارفرما تھا---- یعنی جماعت اسلامی۔

مطالبہ پاکستان کی بنیاد دو اصولوں پر تھی۔ ایک یہ کہ مسلمان' ایمان کے اشتراک کی بنا پر' غیر مسلموں سے ایک الگ قوم ہیں۔ اور (2) ہمارے دین کا تقاضا ہے کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس میں اسلام ایک زندہ حقیقت بن سکے۔

اس جماعت کے بانی' ابو الاعلیٰ مودودی صاحب (مرحوم) کی کوشش تھی کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ دونوں دعاوی باطل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان' محض پیدائشی مسلمان ہیں' حقیقی مسلمان نہیں۔ لہٰذا ان کا' اسلام کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کا دعویٰ ہی باطل ہے۔ دوسرے مطالبہ کے متعلق انہوں نے

کہا کہ یہ لوگ جن حکومت کے قیام کے لئے پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں' وہ اسلامی حکومت نہیں بلکہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔ بلکہ اس سے بھی بدتر' لہٰذا اس بنا پر بھی ان کا دعویٰ باطل ہے اور یکسر غیر اسلامی۔

ان کی اس جدوجہد کے باوجود پاکستان وجود میں آگیا تو یہاں انہوں نے یہ کوشش شروع کی کہ مسلمانوں کی نئی نسل کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ اس زمانے میں اسلامی حکومت کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اسلامی مملکت کے قیام کی شرط اولین یہ ہے کہ اس میں پبلک لاز کا ایسا ضابطہ وضع کیا جائے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اسے ناممکن ثابت کرنے کے لئے مودودی صاحب نے ایک خاص انداز اختیار کیا۔ بیس پچیس سال تک وہ یہ کہتے رہے کہ اسلامی حکومت کی بنیاد "کتاب و سنت" پر ہے۔ یہ بڑا معصوم اور مقدس نعرہ تھا جس کی لم کو سادہ لوح مسلمان سمجھ نہ سکا۔ جب وہ "کتاب و سنت" کی اہمیت اس طرح ثابت کر چکے تو اس کے بعد فرمایا کہ "کتاب و سنت" کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ کھلے الفاظ میں اس کا مفہوم اس کے سوا کیا ہے کہ اب دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ان کے پیش کردہ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل' اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکی ہے۔ ان نوجوانوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ جب اسلامی حکومت قائم ہی نہیں ہو سکتی تو پھر پاکستان کی جداگانہ مملکت کی ضرورت کیا تھی! ہماری نئی نسل کے دلوں میں ان خیالات نے پرورش پانا شروع کر دیا ہے۔ یہ خیالات ذرا پروان چڑھے تو یہاں یہ تحریک ابھرے گی کہ ہمیں ہندوستان کے ساتھ مل جانا چاہئے تاکہ روز روز کے درد سر سے چھٹکارا حاصل ہو۔ مودودی صاحب ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کے ایک حصہ میں مملکت پاکستان قائم کرنے کے خلاف تھے اور اپنے اس نظریہ کی تائید میں کہا کرتے تھے۔ کہ ---

"یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان' پاکستان بن سکتا ہے۔"

(روئداد جماعت اسلامی۔ حصہ پنجم۔ ص 65)

صرف ایک سوال

آپ ان حضرات سے صرف ایک سوال پوچھئے۔ اور وہ یہ کہ:

"کیا کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جا سکتا ہے جسے یہاں کے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں؟"

مودودی صاحب تو واضح الفاظ میں کہہ چکے ہیں کہ ایسا کیا جانا ناممکن ہے۔ لیکن اگر دیگر علماء حضرات اسے ممکن سمجھتے ہوں تو ان سے کہئے کہ ان کا اولین دینی فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر دیں۔ اس سے وہ تمام مسائل حل ہو جائیں گے جو گزشتہ 51 برس سے ساری قوم کے لئے سوہان روح بن رہے ہیں۔

درس قرآن

بر مکان حاجی محمد اعظم خان' وانڈھی گھنڈوالی' میانوالی -- بوقت صبح 9 بجے سے 11 بجے تک' بروز اتوار

فون نمبر: 33647 - 0459

وہ کتاب جس کا پہلا ایڈیشن مدّت سے نایاب تھا

مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں

یعنی

تورات — انجیل — وید — رامائن — مہابھارت — بدھ مت

جین مت — مجوسیت — طاؤازم اور شنٹوازم

کس طرح مرتب ہوئیں، کن کن مراحل سے گزریں اور آج اُن کی کیا حالت ہے۔ آخر میں بتایا گیا ہے کہ

قرآنِ کریم

کس طرح مرتب ہوا، اور کیسے محفوظ چلا آ رہا ہے!

مذاہبِ عالم کے تقابلی مطالعے کے لیے بیش بہا معلومات کا ذخیرہ ہے اور مفکرِ قرآن کے وسعتِ مطالعہ کا آئینہ

تازہ ایڈیشن - عمدہ سفید کاغذ

قیمت: سٹوڈنٹ =/60 اعلیٰ =/120

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلس اقبال (مثنوی اسرار و رموز)

شہر مرغدین

قارئین کو یاد ہو گا کہ پاکستان، حضرت علامہ اقبالؒ کی وفات کے بہت عرصہ بعد وجود میں آیا تھا۔ لیکن اس کا تصور انہوں نے الہ آباد کے خطبہ صدارت (1930ء) میں پیش کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ وہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب "جاوید نامہ" کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنی سیر افلاک کی داستان بیان کی ہے۔ وہ اس سیر میں، فلک مریخ میں، "شہر مرغدین" میں پہنچتے ہیں۔ جس طرح یہ شہر اور وادیاں تصوراتی ہیں، اسی طرح ان کے نام بھی حضرت علامہؒ کے خود ہی تراشیدہ ہیں۔ مرغ دین کا نام اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ یہ اس سر سبز و شاداب بستی کا نام ہے جس کا نظام دین کی بنیادوں پر استوار ہے۔ بالفاظ دیگر حضرت علامہ نے اس میں یہ بتایا ہے کہ اگر دنیا کے کسی قطعہ میں دین کے اصولوں پر معاشرہ قائم ہو جائے تو وہاں کی زندگی کا نقشہ کیا ہو گا۔ چنانچہ حضرت علامہؒ نے پاکستان کی تجویز ہی اس لئے کی تھی کہ یہاں کے رہنے والے مسلمان اپنی زندگی کو قرآنی نظام کے مطابق بسر کر سکیں۔ اس لئے جو کچھ انہوں نے مرغدین کے متعلق کہا ہے، اس سے ان کا مقصود اس پاکستان کا معاشرتی نقشہ تھا جو اس زمانہ میں ان کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ چنانچہ اس داستان کا عنوان ہی انہوں نے "گردش در شہر مرغدین" تجویز کیا تھا۔ اس عنوان کے ماتحت وہ لکھتے ہیں کہ

مرغدین وآں عماراتِ بلند
من چہ گویم زاں مقامِ ارجمند

مرغدین کی وہ بستی ہے جس میں بڑی بڑی سر بفلک عمارات ہیں۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ بستی کیسی ہے اور اس کا مقام کتنا بلند ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش
خوبروے و نرم خوے و سادہ پوش

اس میں رہنے والوں کی زبان شہد سے بھی زیادہ میٹھی اور وہ خود نہایت حسین، خوش گل، مزاج اور عادات کے اعتبار سے بہت نرم اور سادہ۔ اس حقیقت پر غور کیجئے کہ اس شہر کی عمارتیں تو بہت بلند بتائی گئی ہیں، لہٰذا ان کی سادگی سے یہ مقصود نہیں کہ وہ جھونپڑیوں میں رہتے تھے یا وہاں راہبوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیاں تھیں۔ سربفلک عمارتیں لیکن ان میں رہنے والے نہایت سادہ۔

فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب
رازدانِ کیمیائے آفتاب

وہاں فارغ البالی اور مرفہ الحالی کی یہ کیفیت ہے کہ انہیں اکتساب معاش کے لئے کسی قسم کی کوئی پریشانی اٹھانی نہیں پڑتی۔ یہ نہیں کہ وہ محض روٹی کے لئے مارے مارے پھر رہے ہوں اور ان کی ساری زندگی انہی

مشقتوں اور مصیبتوں میں بسر ہو جائے۔ ان کے دماغ معاش کی فکر سے بالکل آزاد ہیں اور اس کے لئے انہیں جانکاہ مشقتیں نہیں اٹھانی پڑتیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن نے قصہ آدم کے تمثیلی بیان میں کہا ہے کہ اے ابنائے آدم! اگر تم وحی کے نظام کو چھوڑ کر اپنے خود ساختہ نظام کے مطابق زندگی بسر کرو گے' تو یاد رکھو تمہیں زندگی کی بنیادی ضروریات کے لئے بھی جگر پاش مشقتوں میں سے گزرنا پڑے گا اور یہ تمہاری نہایت بدبختی ہو گی۔ اسی باب میں سورۂ طٰہٰ کی 116 سے 124 آیات کو دیکھئے جن کے آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ **فمن اتبع ھدای فلا یضل ولا یشقی** ○ (20:123) جب خدا کی رہنمائی کے مطابق معاشرہ قائم ہو گا تو اس میں نہ کسی کی محنت رائگاں جائے گی اور نہ ہی اسے ضروریات زندگی کے لئے پریشانیاں اٹھانی پڑیں گی۔

حضرت علامہؒ نے مرغدین کا یہی نقشہ پیش کیا ہے کہ اس میں

فکر شاں بے درد و سوز اکتساب

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ زمانہ قبل از تاریخ کی زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں نہ تہذیب تھی نہ تمدن' نہ علم تھا نہ سائنس بلکہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ

راز دان کیمیائے آفتاب

کہ وہ' یہ زمین تو ایک طرف' سورج کے اندر چھپی ہوئی قوتوں سے بھی واقف ہیں اور ان کا سارا کاروبار اسی توانائی (Energy) کے زور پر چلتا ہے جسے وہ آفتاب سے حاصل کرتے ہیں۔

ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور
چو نمک گیریم ما از آب شور

ان میں سے جس کسی کو چاندی یا سونے کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے وہ آفتاب کی روشنی سے پوری کر لیتا ہے جس طرح ہم سمندر کے پانی سے نمک نکال لیتے ہیں۔ لیکن وہاں چاندی اور سونے کی ضرورت سکوں کے طور پر استعمال کرنے کے لئے نہیں پڑتی۔ وہاں کوئی شخص اپنی خدمات کا معاوضہ روپیہ پیسہ میں نہیں چاہتا بلکہ

خدمت آمد مقصد علم و ہنر
کارہا راکس نمی سنجد بزر

وہاں علم اور ہنر دونوں کا مقصد یہ ہے کہ ان سے خلقت کی خدمت کی جائے' نہ یہ کہ انہیں بیچ کر دولت کمائی جائے۔ کیونکہ دولت کمانا کسی کے پیش نظر ہی نہیں اس لئے وہاں سکوں کا وجود ہی نہیں۔

کس ز دینار و درم آگاہ نیست
ایں ہناں را در حرم ہا راہ نیست

وہاں کوئی جانتا ہی نہیں کہ دینار کسے کہتے ہیں اور درہم کیا ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ درہم و دینار وہ بت ہیں جو باطل نظام زندگی کے تراشیدہ ہیں۔ جو نظام' خدا کے قوانین پر مبنی ہو اس میں ان معبودان باطل کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ صحیح نظام زندگی میں دولت جمع کرنے کا تصور ہی نہیں آسکتا۔ اس لئے وہاں سکوں کی ضرورت کیا ہے؟

اوپر کہا گیا ہے کہ وہ لوگ سائنس میں اتنی ترقی کر چکے ہیں کہ ان کے تمام کاروبار اسی توانائی کے زور پر چلتے ہیں جسے وہ سورج سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

برطبیعت دیو ماشیں چیرہ نیست
آسماں ہا از دخانہا تیرہ نیست

نہ صرف یہی کہ ان کی فضا مشینوں کے دھوئیں سے پاک و صاف رہتی ہے' بلکہ ان کی طبیعتوں پر بھی ان کے غلبہ اور تسلط کا کوئی اثر نہیں۔ ہمارا یہ زمانہ مشینوں

کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہماری صنعت و حرفت میں مشینیں عام ہو گئی ہیں بلکہ یہ کہ بنیادی طور پر ہماری ساری زندگی میکانیکل ہو گئی ہے۔ اس دور میں خود انسان کو ایک مشین سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاتی اور باہمی معاملات اور برتاؤ میں بھی ایک فرد دوسرے فرد سے اسی طرح ملتا ہے جس طرح مشین کا ایک پرزہ دوسرے پرزہ کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اس سے زیادہ انہیں آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اسی مشینی انداز زندگی کا اثر اتنی دور تک چلا گیا ہے کہ میاں بیوی' باپ بیٹا' بہن بھائی تک میں بھی انسانیت کا رشتہ نہیں بلکہ محض مشینی رشتہ باقی رہ گیا ہے۔ مرغدین میں باہمی تعلقات کی یہ کیفیت نہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

سخت کش دہقاں چرا غش روشن است
از نہاب دہ خدایاں ایمن است

وہاں کا کسان بہت محنتی ہے۔ لیکن اس کی محنت مجبوری کی نہیں۔ وہ اپنی خوشی سے محنت کرتا ہے اور بہت مرفہ الحال ہے۔ اس کے گھر میں خوشی کے چراغ جلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں یہ صورت نہیں کہ زمیندار زمین کا مالک ہو اور کاشتکار زمین میں کھیتی باڑی کرے۔ کاشتکار سارا سال لہو پسینہ ایک کر کے فصل تیار کرے اور زمیندار اس کا حاصل لیجائے اور کاشت کار اس کے رحم و کرم پر ہو۔ نہ ہی وہاں یہ کیفیت ہے کہ پانی کی باریوں پر کسانوں کے لڑائی جھگڑے ہوں اور وہ تھانوں اور کچہریوں میں مصیبتیں بھگتتے پھریں۔

کشت و کارش بے نزاعِ آبجو ست
حاصلش بے شرکتِ غیرے ازو ست

وہاں پانی کی فراوانی ہے اور وہاں کا کسان اپنی محنت کے ماحصل کا آپ مالک ہے۔ اسے کوئی لوٹنے کھسوٹنے والا نہیں۔ یہ تو رہی معاشی زندگی۔ جہاں تک سیاسی زندگی کا تعلق ہے۔

اندراں عالم نہ لشکر' نے قشوں
نے کسے روزی خورد از کشت و خوں

آپ غور کیجئے۔ آج دنیا کی بدترین لعنتوں میں سے ایک لعنت مستقل فوج (Standing Army) کا وجود ہے۔ ابنائے قوم کا بہترین حصہ فوج میں لے لیا جاتا ہے اور یہ لاکھوں نوجوان' دوسروں کے پیدا کردہ رزق پر بہترین زندگی بسر کرتے ہیں' یعنی قوم میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے' اس کا بہترین حصہ سب سے پہلے فوج والوں کو دیا جاتا ہے اور خود فوج والے کسی قسم کے پیداواری کام کاج (Productive Work) میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ اس کے علاوہ قوم کی دولت کا بہت بڑا حصہ ان آلات حرب و ضرب کے بنانے اور سنبھالنے میں صرف ہو جاتا ہے جو ایک فتیلا دکھانے سے فضا میں بھک سے اڑ جاتا ہے۔ قوم کے ان بہترین نوجوانوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو قتل کریں۔ انہیں یہ سب کچھ اسی کے معاوضہ میں ملتا ہے۔ حضرت علامہؒ کہتے ہیں کہ مرغدین میں اس قسم کی کوئی لعنت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا سے قومیتوں کے تنگ دائروں کو مٹا دیا جائے اور ذاتی ملکیت کے نظام باطل کو ختم کر دیا جائے اور تمام نوع انسانی ایک گھرانے کی طرح زندگی بسر کرے' تو دنیا میں نہ فوجوں کی ضرورت باقی رہے نہ سامان حرب و ضرب کی۔ جو نظام' قرآن کی بنیادوں پر قائم ہو گا اس میں آخرالامر یہی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہ تو رہا اہل سیف کا حال۔ باقی رہے اہل قلم سو'

نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ
از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ

مرغدین میں تحریر نے ایک فن کی شکل اختیار نہیں کر

رکھی نہ ہی وہاں قلم سے جھوٹ کو عام کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ وہاں قلم کو ان امور کی نشرواشاعت سے فروغ حاصل ہوتا ہے جو حق پر مبنی ہوں اور جن سے مقصود نفع اندوزی نہ ہو۔ لہٰذا وہاں کے اخبارات و تصنیفات نوع انسانی کی خدمت کا موجب ہیں نہ کہ جھوٹ کو پھیلا کر فروغ حاصل کرنے کا ذریعہ۔

نے بہ بازاراں زبیکاراں خروش
نے صدا ہائے گدلیاں دردِ گوش

ہمارے غلط معاشرہ میں ان لوگوں کا ایک مستقل طبقہ ہوتا ہے جنہیں کام نہیں ملتا یا جو کام کئے بغیر دوسروں کی محنت پر جیتے ہیں۔ جو لوگ کام کاج میں مصروف رہتے ہیں انہیں اس کی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ ہنگامے برپا کرتے رہیں۔ اس لئے مرغدین میں ان ہنگاموں کا شور کہیں سنائی نہیں دیتا۔ جنہیں ہمارے ہاں بیکار لوگ برپا کرتے رہتے ہیں۔ نہ ہی وہاں کوئی بھک منگا نظر آتا ہے جس کی آواز درد گوش بنے۔

یہ تو تھا وہ نقشہ جو اقبالؒ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد "حکیم مریخ" نے ایک فقرہ میں یہ بتا دیا کہ مرغدین کے معاشرہ کا ماحصل کیا ہے یعنی

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اس نے کہا کہ ہمارے ہاں کوئی شخص اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اس لئے کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور جب کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا تو پھر نہ کوئی کسی کا غلام ہوتا ہے نہ کوئی غلاموں کا آقا۔ حتیٰ کہ نہ یہاں کوئی حاکم ہے اور نہ محکوم۔ خدا نے جو غیر متبدل قوانین عطا فرما دیئے ہیں سب اسی کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں اور کوئی انسان کسی انسان پر حکومت نہیں کرتا۔ یہی قرآنی تعلیم کا مقصود و منتہا اور یہی اسلامی دستور و آئین کا ماحصل ولب لباب ہے۔

یہ ہے نقشہ اس معاشرہ کا جس کے لئے حضرت علامہؒ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک قطعہ زمین مل جائے۔ ان کے ذہن میں نقشہ یہ تھا کہ اس قطعہ زمین میں مسلمان قرآنی آئین کے مطابق معاشرہ قائم کریں اور اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہو جسے انہوں نے مرغدین کے معاشرہ کے نام سے تعبیر کر کے جاوید نامہ میں پیش کر دیا۔

علامہ اقبالؒ نے اسی جاوید نامہ میں، علامہ جمال الدین افغانی کی زبانی بتایا ہے کہ "حکومت الٰہی" کے خط و خال کیا ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حکومت میں انسان صرف قوانین خداوندی کا محکوم ہوتا ہے۔ ایسے انسان کو بندۂ حق کہتے ہیں اور

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ اوکس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس
ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش زحق
زشت و خوب و تلخ و نوشینش زحق

اس حکومت کے آئین و دستور کی بنیادیں وحی خداوندی پر ہوتی ہیں جو اپنی جگہ پر اٹل اور غیر متبدل ہے۔ وہاں تمام معاملات کے فیصلے اسی کی روشنی میں ہوتے ہیں۔ بندۂ حق کی محبت بھی حق کے لئے ہوتی ہے اور مخالفت بھی حق کے لئے۔ اس کے مقابلہ میں انسانوں کے خود ساختہ نظام کی بنیاد تنہا عقل پر ہوتی ہے اور عقل اور وحی میں فرق یہ ہے کہ

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

عقل صرف اس فرد یا اس قوم کے مفاد کو دیکھ سکتی ہے جس کی وہ عقل ہے۔ وہ اس کے سوا کسی دوسرے کے مفاد کا خیال نہیں رکھ سکتی۔ اس کے برعکس' وحی کے قوانین چونکہ اس خدا کی طرف سے ملتے ہیں جو رب العالمین یعنی تمام نوع انسانی کو نشوونما دینے والا ہے' اس لئے اس کی نگاہ میں تمام انسانوں کا مفاد یکساں طور پر ہوتا ہے۔ لہٰذا' جس نظام کی بنیاد وحی کے غیر متبدل قانون پر ہو گی' اس کا مقصود تمام نوع انسانی کی نشوونما ہو گا اور یہی حکومت الٰہی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف
وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

بندۂ حق میدان جنگ میں ہو یا صلح کی کانفرنس میں' ہر جگہ اس کے پیش نظر عدل و انصاف ہوتا ہے۔ وہ نہ کسی پر ظلم کرتا ہے نہ اپنے آپ پر ظلم ہونے دیتا ہے۔ وہ کٹتا اس سے ہے جو حق کی مخالفت کرتا ہے اور اپنا رشتہ پیوست اس سے کرتا ہے جو حق کی حمایت کرتا ہے۔ اس میں نہ وہ کسی کی رعایت کرتا ہے نہ وہ کسی سے خوف کھاتا ہے۔ یہی ہے وہ بنیادی حقیقت جو حکومت خداوندی کے اندر جلوہ بار ہوتی ہے۔ اسی قسم کی حکومت تھی جسے علامہ اقبالؒ پاکستان میں **متشکل** دیکھنا چاہتے تھے اور آج ہر وہ شخص دیکھنا چاہتا ہے جس نے پاکستان کے حصول میں اس نقشہ کو پیش نظر رکھا تھا۔ طلوع اسلام اسی قسم کے نظام اور آئین کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اسی کو نظام ربوبیت کہا جاتا ہے۔

۲۵ سالہ تجربہ کار
پیپلز کلیئرنگ ایجنسی
کسٹم ہاؤس سے منظور شدہ
کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹ
کلیئرنگ اور فارورڈنگ کے معاملات میں ایک قدم آگے
ہمارے ۲۵ سالہ تجربہ سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فائدہ۔
ہم آپکی خدمت کیلئے ہمہ وقت تیار ہیں۔
۵۔ وقار سینٹر، فرسٹ فلور رام بھارتی اسٹریٹ، جوڑیا بازار۔ کراچی
فون: ۲۲۳۶۱۲۸ ، ۲۲۳۱۰۴۵-۲۲۳۷۵۳۷
فیکس نمبر :- ۲۲۱۹۷۸۲
ٹیلیکس: ۲۱۰۴۳ BTC PK

علامہ پرویز بالعموم ایک مفکر قرآن کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ان کی ایک اور خصوصیت بھی تھی اور وہ تھی

شارح کلام اقبالؒ کی منفرد اور بے مثال حیثیت

آپ کو کلام اقبالؒ پر کس قدر عبور حاصل تھا' اس کا اندازہ کلام اقبالؒ سے متعلق ان کی شرح کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔علامہ پرویز کہتے ہیں کہ کلام اقبال سے ان پر قرآن فہمی کی منزلیں بے حد آسان ہوتی گئیں۔انہوں نے سب سے پہلے کلام اقبال کے جس منتخب مجموعہ کی شرح کی وہ ان کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب مثنوی "اسرار خودی و رموز بے خودی" تھی۔یہ شرح بالالتزام مجلّہ طلوع اسلام میں فروری 1955ء سے مارچ 1957ء تک شائع ہوتی رہی اور 'اقبالؒ اور قرآن کو سمجھنے میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔اب اسے کتابی شکل میں

بعنوان

مجلس اقبالؒ' شرح اسرار و رموز

کے نام سے شائع کیا جا چکا ہے۔

قیمت سٹوڈنٹ ایڈیشن =/150---اعلیٰ ایڈیشن =/300

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بشیر احمد عابد۔ (کویت)

اقبالؒ اور طلوع اسلام

ہر سال ماہ نومبر صفیران چمن اقبالؒ کے لئے بہار کا پیام لاتا ہے۔ جس طرح بہار میں شگوفے چٹکتے ہیں' کلیاں مسکتی ہیں' ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے نفیس و لطیف جھونکے سرسبز و شاداب درختوں کی شاخوں میں لچک اور پھولوں میں جنبش پیدا کرتے ہیں اسی طرح ماہ نومبر میں صفیران چمن اقبال زمزمہ سنج اور نغمہ بار ہوتے ہیں اور فضائے وطن اقبالؒ کے گیتوں سے گونج اٹھتی ہے۔ ملت اسلامیہ کے عظیم مفکر اور حکیم یگانہ' صفت کے حضور گلہائے عقیدت پیش کرنے اور ان کے نور بصیرت کو وجہ شادابی قلب ونگاہ بنانے کے لئے جگہ جگہ پرنور اور جذب وکیف سے معمور محافل سجائی جاتی ہیں۔

طلوع اسلام بھی چمن اقبالؒ کا بلبل رنگین نوا ہے۔ ماہ نومبر اس کے رگ وپے میں بجلیاں بھر دیتا ہے اور اس کے ولولہ شوق کو دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ اس کے ہاں یوم اقبالؒ کو ہر سال بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ امسال بھی ایوان اقبال لاہور میں اقبالؒ اور قرآن کے عنوان سے ایک شاندار سیمینار کا اہتمام کیا جا رہا ہے جس میں ملک کے عظیم دانشور اور مفکر حضرت علامہ کے تدبر وفراست کی عظمت کو سلام شوق پیش کریں گے۔ بلاشبہ ملت پاکستانیہ کا بچہ بچہ اس نابغہ روزگار ہستی کیلئے اپنے دل میں عقیدت واحترام کے بے پناہ جذبات رکھتا ہے۔ ہم سب کے دل ان کے عشق و محبت سے لبریز ہیں۔ حضرت علامہ کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ ان کا سب سے پہلے عمومی احسان عالمگیر انسانیت پر ہے۔ جس کی تاریک راتوں کو انہوں نے نور سحر سے روشناس کر دیا' دوسرا احسان ملت پاکستانیہ پر ہے جس کے راہ گم کردہ قافلے کو انہوں نے نشان منزل عطا کیا۔

ہم جب تاریخ کے اوراق الٹتے ہیں تو ہمیں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں برصغیر میں مسلمان قوم کی جو حالت دکھائی دیتی ہے وہ بعینہٖ وہی ہو چکی تھی جس کا نقشہ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل میں کھینچا ہے۔ بنی اسرائیل جناب موسیٰؑ جیسے فرعون شکن داعی انقلاب کی دعوت جہاد کے اولین مخاطب تھے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ خدا کا یہ اولوالعزم پیغمبر انہیں بشارت دیتا ہے کہ یہ سرزمین مقدس تمہارے نام لکھی جا چکی ہے۔ اٹھو اور اس پر قابض ہو جاؤ۔ لیکن ان پر عافیت کوشی اور سہل انگاری کی افسردگی اس درجہ طاری ہو چکی ہے اور فریق مخالف کا خوف انہیں اس طرح چھلاوا بن کر ڈراتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نہ صاحب! اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوۡا فِيۡهَا۔ جب تک اس سرزمین میں بسنے والے موجود ہیں ہم وہاں قطعاً پاؤں نہیں رکھیں گے۔ فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ۝ تم اور تمہارا خدا جاؤ اور ان سے لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں (5:21)۔ برصغیر کے مسلمانوں کی ذہنی حالت اتنی ہی پست ہو چکی تھی وہ سب کے سب ذلت و مسکنت کے

عذاب میں مبتلا تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شجر ملت کی ہر شاخ پر افسردگی اور پژمردگی چھا چکی تھی۔ مدت ہائے دراز کی غلامی اور محکومی سے ان کے حوصلے پست، ہمتیں کمزور، افکار جامد، اعمال خامد، ارادے سقیم، اور تمنائیں عقیم ہو چکی تھیں۔ ہر شعبہ زندگی بساط بے نظام اور ہر فرد کاروان ناقہ بے زمام تھا۔ دماغ فکر سے عاری، دل سوز سے خالی، نگاہیں بے نور، قلوب بے حضور، قوم کیا ایک راکھ کا ڈھیر تھی جسے مخالف ہوائیں جدھر جی چاہے اڑائے پھر رہی تھیں۔ یہ تھا وہ زمانہ جس میں مبداء فیض کی کرم گستری نے اس قوم کو اقبالؒ جیسا مرد خود آگاہ و خدا مست عطا کر دیا جس نے اپنی نفس گدازیوں سے اس مردوں کی بستی میں صور اسرافیل پھونک کر ان میں حیات نو کے آثار پیدا کر دیئے اور اپنی شعلہ نوائیوں سے راکھ کے اس ڈھیر میں پھر سے زندگی کی چنگاریاں نمودار کر دیں۔ فرماتے ہیں ۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن خیالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

اور پھر ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں ۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

حضرت علامہ اقبالؒ کے اس انقلاب انگیز پیغام نے مسلمان قوم کو نیا دماغ، نئی زندگی اور نئی آرزوئیں عطا کیں۔ وہ قائداعظمؒ کی مدبرانہ قیادت میں منظم ہو کر بپھرے ہوئے شیروں کی طرح اٹھے اور ہر مخالف قوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہی مغلوب و محکوم قوم جو کل تک نہایت ذلیل و حقیر شمار کی جاتی تھی۔ اپنی ایک آزاد مملکت کی وارث بن گئی۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ مملکت خداداد پاکستان کا وجود حضرت علامہ کی آہ سحر گاہی اور نالہ نیم شبی اور قائداعظمؒ کی مدبرانہ قیادت اور اولوالعزمی کا مرہون منت ہے۔ ہمارے سر ان عظیم ہستیوں کے حضور شکر و امتنان کے ہزارہا سجدے لیئے جھکے ہوئے ہیں۔ ہم ان کے تدبر و فراست اور عزم و ایمان کو سلام کرتے ہیں۔

حضرت علامہ اقبالؒ علیہ الرحمہ علم و بصیرت کے پیکر نورانی اور عرفان و خودی کے بحر پیکراں تھے۔ گو کہ انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ لاہور میں گذارا اور ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی کہلائے مگر حقیقت میں وہ کسی ایک ملک، کسی ایک قوم، اور کسی ایک دور کی شخصیت اور ملکیت نہ تھے بلکہ وہ تمام نوع انسانیت کی امانت تھے۔ ان کا پیغام وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ انہوں نے دنیا کو اجتماعی زندگی کا درس عمل دیا۔ رجائیت اور خود داری پر اپنے فلسفے کی بنیاد رکھی۔ زندگی کی موجوں میں تلاطم پیدا کیا۔ ذہنوں کو رفعت و بلندی بخشی۔ وہ اپنے کلام میں فکر و حیات کی وہ آگ سلگتی چھوڑ گئے ہیں جس سے قومیں زندگی اور قوت کی حرارت حاصل کرتی رہیں گی۔ وہ ایک معلم و مفکر ہی نہ تھے بلکہ انسانی ضمیر کے محرک بھی تھے اور ہمارا ایمان ہے کہ جب تک علم و حکمت باقی رہے گا۔ جب تک انسانیت کے احترام کا جذبہ سینوں میں ابلتا رہے گا۔ جب تک ملوکیت و حکمرانی کی اصلاحی تحریکیں جاری رہیں گی اس وقت تک اس حکیم اسلام اور مصلح اعظم کی یاد بھی تازہ رہے گی ۔

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی نمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی
رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

قارئین گرامی قدر! یہ طلوع اسلام کی انتہائی خوش نصیبی ہے کہ اس نے اقبالؒ جیسی دانا و بینا ہستی کی کریمانہ آغوش میں جنم لیا اور ان کے فیضان نظر سے جلاء پائی۔ طلوع اسلام دراصل علامہ اقبالؒ کی ایک خوبصورت نظم کا عنوان ہے اور تحریک طلوع اسلام اسی نظم کا خوبصورت پیکر مجسم ہے۔ یہ 1938ء کی بات ہے۔ تحریک پاکستان کی جدوجہد ایک انتہائی نازک موڑ پر کھڑی تھی۔ ملت اسلامیہ کا دیدہ ور سپہ سالار قائداعظمؒ علیہ الرحمہ جنگ آزادی کے ہر محاذ پر نہایت مشاقی اور حسن تدبیر کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ لیکن ان میں ایک محاذ ایسا بھی تھا جس کے لئے انہیں ایک جگر دار سپاہی کی ضرورت پڑی جو نظریہ پاکستان کی دینی اساس کا دفاع کر سکے۔ کیونکہ نظریہ پاکستان کی مخالفت نہ صرف ہندو اور انگریز کر رہے تھے بلکہ کئی مسلمان علماء بھی اس کی شدت سے مخالفت کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی وفات تک یہ محاذ خود سنبھال رکھا تھا۔ لیکن وفات سے کچھ عرصہ پہلے آپ نے قائداعظمؒ کو مشورہ دیا کہ ان کے بعد اس کام کو بہتر طور پر سرانجام دینے کیلئے علامہ غلام احمد پرویزؒ موزوں ترین شخص ہیں۔ علامہ موصوف اس وقت ہند سرکار کے ملازم تھے اور سول سیکریٹریٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ تحریک پاکستان کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ قائداعظم علیہ الرحمہ نے علامہ اقبالؒ کے ایماء پر یہ اہم ذمہ داری پرویز صاحب کے سپرد کر دی۔ اس کے بعد، پرویز صاحب نے جس طرح اس محاذ کو سنبھالا اور جس طرح اپنے قائد کو انگریز اور ہندو سے نمٹنے کیلئے فرصت مہیا کی اس پر 1938ء تا 1942ء کے ماہنامہ طلوع اسلام کے فائل شاہد ہیں۔ جون 1942ء میں نامساعد حالات کی بنا پر ماہنامہ طلوع اسلام کی اشاعت کچھ عرصہ کیلئے روک دی گئی لیکن اس سے علامہ پرویزؒ کی تحریک پاکستان کے سلسلہ میں سرگرمیوں میں چنداں کمی واقع نہ ہوئی بلکہ اس سے ان کو موقعہ ملا کہ وہ حضرت قائداعظمؒ کے نسبتاً زیادہ قریب ہو گئے اور دینی معاملات میں ان کے ذاتی مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ حضرت قائداعظمؒ کے اس زمانے کے خطابات میں ایک حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ انہوں نے ہر جگہ اور ہر موقع پر قرآن کریم اور صرف قرآن کریم سے راہنمائی حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ یہ درحقیقت قومی یک جہتی کی وہ واحد اساس ہے جو قائداعظمؒ کی زبان سے قوم تک پہنچتی رہی اور جو مفکر قرآن علامہ پرویزؒ کا اصل سرمایہ حیات ہے۔ قائداعظم علیہ الرحمہ کو قرآن کی زبان عطا کرنے میں مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ نے جو کردار ادا کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پرویز صاحب کے تحریک پاکستان میں کردار اور قائداعظمؒ کے ساتھ مراسم کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار مرحوم مولانا کوثر نیازی نے پاکستان کی قومی اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس منعقدہ 21 دسمبر 1976ء میں بانی پاکستان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ جناب غلام احمد پرویزؒ جن سے کسی کو ہزار اختلاف ہو لیکن قائداعظمؒ کے ساتھ ان کی رفاقت اور تحریک پاکستان میں ان کی قلمی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

پرویز صاحب اس زمانے میں حکومت ہند کے مرکزی سیکریٹریٹ میں ملازم تھے۔ لیکن اس کے باوجود کیفیت یہ تھی کہ وہ دن کو دفتر میں ہوتے تو شام کو قائداعظمؒ کی کوٹھی پر۔ خود ان کا اپنا مکان بھی تحریک پاکستان کی

سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پیر علی محمد راشدی نے لکھا ہے کہ ان دنوں سرکاری افسروں میں صرف تین افسر ایسے تھے جنہوں نے تحریک پاکستان میں پوری تندہی اور گرمجوشی سے حصہ لیا اور ان تین میں سے ایک پرویز صاحب تھے۔

حضرت علامہ اقبالؒ کے ساتھ پرویز صاحب کا تعارف اس وقت ہوا جب آپ کی عمر 17-18 برس تھی۔ حضرت علامہ نے اپنی پہلی مطبوعہ تصنیف مثنوی "اسرار خودی و رموز بے خودی" کی طباعت پر اس کا ایک نسخہ اپنے دستخط سے پرویز صاحب کے دادا جان حکیم چوہدری رحیم بخش صاحب کو ارسال فرمایا تھا۔ انہوں نے یہ مثنوی خود پرویز صاحب کو پڑھائی۔ بقول پرویز صاحب دادا جان کا انداز درس و تدریس اور مثنوی کی علمی رفعت نے اس قدر اثر کیا کہ حضرت علامہ کی عظمت و احترام میرے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئے۔ اس کے بعد 1921ء میں پرویز صاحب جب لاہور آئے تو ان کے دادا جان نے انہیں حضرت علامہ سے ملاقات کرنے کی خاص طور پر تاکید فرمائی۔ پرویز صاحب کہا کرتے تھے کہ دادا جان نے ان کا رخ دانش کدۂ اقبالؒ کی طرف موڑ کر ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ فیضان اقبالؒ سے ہی ان کی سمجھ میں یہ حقیقت آئی کہ قرآن کریم کو محاورہ عرب اور تصریف آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور کسی خارجی عنصر کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔ کلام وپیام اقبالؒ کا مرکز بھی قرآن اور محور بھی قرآن۔ اس کی تعلیم کو عام کرنا علامہ اقبالؒ کی زندگی کا مشن اور ان کا نصب العین حیات تھا۔ وہ اس کو ایک عملی نظام کی شکل میں متشکل دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے مسلمان قوم کو پاکستان کا تصور دیا۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں قرآنی پیغام اور حقائق کو حسن کارانہ انداز سے اس جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ کلام اقبالؒ کا بیشتر حصہ قرآن حکیم کی تشریح و تفسیر پر مبنی ہے اور اقبالؒ اور قرآن پرویز صاحب کا خاص موضوع رہا ہے۔ اس نسبت سے کلام اقبالؒ کی شرح میں جو مقام پرویز صاحب کو حاصل ہے وہ شاید ہی کسی اور صاحب فکر کو نصیب ہو سکے۔ آپ اپنی زندگی میں کلام و پیام اقبالؒ کے مستند شارح کی حیثیت سے تسلیم کئے جاتے رہے۔ لیکن افسوس! صد افسوس کہ تحریک پاکستان کے ایسے مخلص سپاہی اور چمن اقبالؒ کے ایسے بلبل رنگیں نوا و دیدہ ور کو جس بے اعتنائی سے نظر انداز کیا گیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی گرانقدر خدمات کو ایک خاص منصوبے کے تحت منظر عام پر آنے نہیں دیا گیا۔ ایک مرتبہ کسی محفل میں آپ سے یہ سوال پوچھا گیا کہ ملک میں قائداعظمؒ اور اقبالؒ کے حوالے سے اتنی تقاریب منعقد ہوتی ہیں آپ ان میں شریک کیوں نہیں ہوتے تاکہ پیغام قرآن کا دائرہ وسیع ہو۔ آپ نے جواباً عرض کیا کہ اس کی مجھے دعوت نہیں دی جاتی اور میرے خیال میں یہ حضرات مجھے اس لئے نہیں بلاتے کہ میں بالواسطہ یا بلا واسطہ قرآن کریم پیش کرتا ہوں۔ خواہ اس کا واسطہ کلام اقبالؒ ہو یا پیغام قائداعظمؒ اور قرآن ہماری قوم کے مزاج کے موافق نہیں۔ اسی لئے ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ اس کی آواز عام نہ ہونے پائے۔ مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ میرے ہاں اپنے ذرائع ابلاغ موجود ہیں لیکن اس سے جس طرح قوم اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے قرآنی تدبر و فراست سے محروم ہوتی جاتی ہے اس کا افسوس ضرور ہوتا ہے۔ اقبالؒ سے متعلق تقاریب ہوں یا قائداعظمؒ سے متعلق انہیں رسمی طور پر منایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی اس وقت تک کیا جائیگا جب تک اس سے کچھ مفاد حاصل ہوتے ہوں۔ اس کے بعد فقط تاریخ کی کتابوں میں ان کے نام رہ جائیں گے۔ ہماری یہی بدبختی ہے کہ جس کی بنا پر قرآن کریم تلاوت تک اور

اقبالؒ شاعری تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور قائداعظمؒ کو ایک سیکولر لیڈر سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا جاتا۔

علامہ پرویز علیہ الرحمہ نے اپنی زندگی قرآنی فکر کی نشرواشاعت کیلئے وقف کر رکھی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی صلہ و ستائش کی تمنا نہیں کی۔ موقعہ پرست اور بخیل لوگوں نے ان کے راستے میں کئی رکاوٹیں کھڑی کیں لیکن وہ پرویز صاحب کی ہمت و حوصلے کو شکست نہ دے سکے۔ آج ایک زمانہ ان کی بے لوث خدمات کا معترف ہے۔ کچھ عرصہ پہلے حکومت پاکستان نے کارکنان تحریک پاکستان کی خدمات کو سراہنے کیلئے ایک الگ شعبہ' شعبہ تحریک پاکستان کے نام سے قائم کیا ہے اور اس طرح قومی تاریخ کے ان عظیم مجاہدوں کو سرکاری سطح پر اعزازات دینے کا اہتمام کیا ہے۔ اس ضمن میں علامہ پرویزؒ کو بھی 14 اگست 1989ء کو (بعد از وفات) حکومت پنجاب نے تحریک پاکستان گولڈ میڈل کا اعزاز پیش کیا ہے۔ 1938ء میں طلوع اسلام کے نام سے انہوں نے جو ننھا منا سا پودا لگایا تھا آج پچاس سال بعد وہ ایک ایسا شجر طیب بن چکا ہے کہ جس کی جڑیں پاتال میں مضبوطی سے گڑی ہوئی اور شاخیں فضائے آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ طلوع اسلام ایک مجلہ ہی نہیں بلکہ ایک زندہ اور حیات آفرین تحریک کا نام ہے۔ طلوع اسلام ایک جگمگاتا چراغ ہے۔ ایسی ٹھنڈی اور صاف روشنی دینے والا چراغ جیسے ستارہ صبح گاہی فضا کی تاریکیوں میں نور پاش ہو اور اس چراغ کو ایک صاف اور شفاف شیشے کے فانوس میں رکھ دیا گیا ہو۔ تاکہ وہ تمام خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ خود فانوس بھی ایسا درخشندہ گویا وہ چمکتا ہوا تارہ ہے۔ جس سے نور کی ندیاں رواں ہیں۔ یہ چراغ ایسے تیل سے روشن ہے جو اس کا محتاج نہیں کہ کوئی خارجی روشنی اسے جلائے۔ یہ خود روشن ہے اور دوسروں کو بھی روشنی دے رہا ہے۔ طلوع اسلام ایک ایسی تحریک کا نام ہے جو ہر نسبت سے بلند ہو کر خالص منفعت انسانیت کے نقطہ نظر سے کام کر رہی ہے۔ ہم جو اپنے آپ کو اس تحریک کا ادنیٰ سپاہی سمجھتے ہیں' قومی یک جہتی اور ملکی سلامتی کیلئے پوری قوم کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتے ہیں' ہمارا تعلق نہ تو کسی سیاسی جماعت سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقے سے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ دور کی سیاست اور مذہب دونوں قومی اتحاد ویکجہتی کیلئے زہر ہلاہل بن چکے ہیں۔ انہوں نے جسد قومی میں صوبائی تعصب' لسانیت اور فرقہ واریت کا زہر بھر دیا ہے۔ جبکہ طلوع اسلام قومی اتحاد ویکجہتی کی علامت ہے۔ اس کے پرچم کو وہ اٹھاتا ہے جو رنگ' نسل' زبان اور مذہب کی تمام نفرتوں اور امتیازات کو مٹا کر یہاں پہنچتا ہے۔ ہمیں وحدت امت اور سلامتی اپنے ہر مفاد سے عزیز تر ہے۔ ہم امت کے اجتماعی مفاد کیلئے اپنا سب کچھ ایثار کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار بیٹھے ہیں۔ ہماری قومی تاریخ کے گذشتہ پچاس سال میں طلوع اسلام کا کردار اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔ طلوع اسلام نے نہ تو کبھی کسی ہنگامہ آرائی میں حصہ لیا اور نہ ہی کسی فساد انگیزی یا فتنہ پردازی کا موجب بنا۔ نہ تو اس نے دھرنے مارے اور نہ ریلے ریلیاں نکالیں! ہنگامہ آرائی اور فساد انگیزی اس کے منصب کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ یہ قرآن کے عظیم پیغام کا علمبردار ہے اور قرآن کا انسانیت کی طرف پہلا پیغام یہ ہے کہ ..... لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ زمین میں فساد مت پھیلاؤ۔ (2:11)- کیونکہ - اِنَّ اللّٰہ لَا یحبّ الفَسَاد۔ خدا فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ قرآن کہتا ہے کہ تمام نوع انسانی امت واحدہ ہے اور تم سب کا مفاد اجتماعی زندگی بسر کرنے میں ہے۔ (2:213)- اللہ تعالیٰ نے حیاتِ انسانی کے لئے جو بلند نصب العین متعین کیا ہے اسے ہم اجتماعی زندگی کے تقاضے پورے کر کے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ انفرادی مفاد پرستوں سے یہ نہیں ہو گا۔ اسی لئے قرآن کریم میں جتنے بھی احکام بیان ہوئے ہیں وہ سب

کے سب اجتماعی احکام ہیں۔ جیسا کہ سورہ النور کی آیت نمبر 31 میں معاشرتی احکام بیان کرنے کے بعد فرمایا وتو بو اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "اے جماعت مومنین! تم سب کے سب مل جل کر اجتماعی طور پر ان قوانین پر عمل درآمد کرو تاکہ تمہیں ترقی و استحکام نصیب ہو سکے" اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ میری جنت میں جانے کی ایک شرط یہ ہے کہ تم میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو جاؤ"۔ نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ آپؐ کی زندگی قرآنی تعلیمات کا زندہ پیکر تھی۔ آپؐ کی سیرت طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے امت کو ہمیشہ اجتماعی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی اور فرقہ واریت کی شدید مذمت کی ہے خواہ وہ سیاسی پارٹی بازی کا نتیجہ ہو یا مذہبی نفرتوں کی پیداوار! ایک حدیث شریف میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ لا اسلام الا بالجماعتہ۔ اسلام جماعت کے بغیر کچھ نہیں۔ ایک اور حدیث حضرت حارث اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا - میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں۔ جماعت کا' سننے کا' اطاعت کا' ہجرت کا' اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔ یعنی آپؐ کا مطلب تھا کہ جماعت ہو اور جماعتی زندگی بسر کرو' تمہارے اجتماعی معاملات کا جو ذمہ دار ہو اس کی بات غور سے سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین باتیں ایسی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کے دل میں نفاق پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایک یہ کہ جو بھی عمل کرے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کرے۔ دوسری یہ کہ جو لوگ اجتماعی معاملات کے ذمہ دار ہوں ان کے ساتھ خیر خواہانہ معاملہ کرے۔ تیسری چیز یہ کہ جماعت کے ساتھ چمٹا رہے۔ جماعت کے افراد کی دعائیں اس کی حفاظت کریں گی۔

طلوع اسلام نے ہمیشہ نبی اکرم ﷺ کا دامن تھامے رکھا ہے۔ کیونکہ یہ دامن درحقیقت قرآن کا دامن ہے۔ اسی لئے اس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے کہ۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ جس نے رسول کی اطاعت کی وہ یوں سمجھے کہ اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اللہ اور رسول کی اطاعت میں تفریق پیدا کرنا کفر ہے۔ اور اللہ و رسول کی خالص اطاعت طلوع اسلام کا نصب العین ہے۔ ہمارے نزدیک اللہ و رسول کی حتمی ویقینی اطاعت کا ذریعہ قرآن کریم ہے۔ اگر مسلمان قوم اپنے سماجی ومعاشی دائروں میں قرآن کریم کی اقدار کو جزو ایمان بنا لے تو آج بھی اسے اقوام عالم میں ممتاز مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے بھی مسلمان قوم کے مرض کہن کا علاج یہی آب نشاط انگیز تجویز کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت' جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد' جہاں دیگر شود

اور قائداعظم علیہ الرحمہ نے بھی اس راہ گم کردہ قوم کی رہنمائی اسی سرچشمہ نور کی طرف کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطہ اخلاق ہے جو مذہب' معاشرت' تجارت' عدالت' فوج' سول اور فوجداری کے تمام قوانین اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات' روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا' اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا' ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیے اور اس طرح اپنا مذہبی

پیشوا آپ بن جانا چاہئے"۔

قارئین گرامی قدر! قائداعظمؒ ہو، اقبالؒ ہو، یا طلوع اسلام ہم سب کا قرآن کریم کی عظمت و جامعیت پر ایمان ہے۔ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کا صحیح طریق یہ ہے کہ ہم اس کتاب عظیم کی راہنمائی میں فیصلے کریں اور یہ فیصلے اسی طریقے پر ہوں جو خلافت علی منہاج نبوت میں رائج تھا۔ یعنی ایک امت جس میں کوئی فرقہ نہ ہو۔ ان کا ایک ضابطہ قوانین اور ان قوانین کو نافذ کرنے والی ایک اتھارٹی ہو۔ قرآن کریم کو، جو کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ کتاب ہے قانون کی اصل وبنیاد اور سند وحجت قرار دیا جائے اور اس میں جن امور کی اصولی طور پر راہنمائی دی گئی ہے ان کے جزئی احکام باہمی مشاورت سے خود متعین کئے جائیں۔ ایسا کرنے میں فقہ وروایات سے استفادہ کیا جائے ان میں جو قوانین قرآن کے خلاف نہ جاتے ہوں اور ہمارے زمانے کے تقاضے پورے کرتے ہوں انہیں علی حالہ رکھ لیا جائے اور جو ان تقاضوں کو پورا نہ کرتے ہوں ان کی جگہ نئے قوانین مرتب کر لیے جائیں۔ باہمی مشاورت اور قانون سازی کی تمام تر ذمہ داری اسلامی حکومت کی ہونی چاہئے اور اس کے فیصلے عدالت عالیہ میں قابل مواخذہ ہوں۔ قرآنی مملکت میں، امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآن کریم نے اس باب میں واضح طور پر کہہ دیا ہے۔ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (18:28)۔ "جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے اور اپنے مفادات وجذبات کے پیچھے لگ جائے اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں تو اس کی اطاعت مت کرو"۔ اسی بنا پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ "اگر ایک ناک کٹا سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم) قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کے قواعد وضوابط شامل ہوں گے جن کی رو سے ارباب اقتدار کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کریں گے۔ آئینی اور قانونی طور پر ان کا مواخذہ ہو سکے گا۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

خریداران محترم توجہ فرمائیں

جن کرم فرماؤں کا سالانہ زر شرکت دسمبر 1998ء کو ختم ہو رہا ہے۔ وہ آئندہ سال کے لئے اپنا سالانہ زر شرکت 15 دسمبر 1998ء تک بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیج دیں۔

جن کھاتہ داران نے اپنے کھاتوں سے شمارے جاری کرا رکھے ہیں۔ وہ اپنی فہرست 15 دسمبر 1998ء تک ادارہ کو بھجوا دیں۔ تاکہ آئندہ سال کے لئے تجدید کر دی جائے۔ شکریہ

سرکولیشن منیجر

وہ کون سا دماغ ہے ـــ

جس میں ـــ اِس قِسم کے سوالات نہیں اُبھرتے کہ :

- کیا انسان کی قِسمت پہلے سے لکھی ہوتی ہے ؟
- کیا سب کچھ خُدا کی مرضی سے ہوتا ہے ؟
- کیا غریبوں کی قسمت ہی ایسی ہے کہ وہ ساری عُمر دھکّے کھاتے رہیں ؟
- کیا خُدا کو ایسا ہی منظور ہے ؟
- کیا موت کا ایک دن مقرر ہے یا وہ آگے پیچھے بھی ہو سکتی ہے ؟
- بعض بچے پیدائشی اندھے ، لُولے ، لنگڑے کیوں ہوتے ہیں ؟ کیا یہ بھی خدا کی مرضی سے ہوتا ہے ؟
- اگر خُدا کے ہاں عدل ہے تو وہ ظالموں کو ظلم سے کیوں نہیں روکتا ؟
- کیا دُعا سے تقدیر بدل جاتی ہے ؟ اگر نہیں بدلتی تو ہم دُعا کیوں کرتے ہیں ؟

یہ ، اور اِسی قِسم کے دیگر سوالات کا تعلق **مسئلۂ تقدِیر** سے ہے جس نے انسانی ذہن کو ہمیشہ طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔

یہی وہ مسئلہ تھا جس کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے **کارل مارکس** نے کہہ دیا کہ :

مذہب عوام کے لیے افیون ہے

جناب **پرویزؔ** نے ـــ دُنیا کے اِس مُشکل ترین مسئلہ کو ـــ اپنی تصنیف

کتاب التّقدیر

میں ، قرآنِ کریم کی روشنی میں ، اس عُمدگی سے حل کر دیا ہے کہ اس کے بعد ذہن میں کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔

کتاب بڑے سائز کے چار سو سے زاید صفحات پر مشتمل ہے اور عُمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ جلد مضبوط ـــ اور گردپوش جاذبِ نگاہ (نقشِ ثانی) ـــ قیمت : سٹوڈنٹ 120/= ـ اعلیٰ 240/=

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید انعام الحق

تقدیر کے عقیدہ جبر پر علامہ اقبالؒ کی ضرب کاری

قوموں کے عروج وزوال کا انحصار ان کے اعمال وافعال سے قبل ان کے عقائد و نظریات پر ہوتا ہے کیونکہ اعمال کی بنیاد افکار ونظریات ہوتے ہیں۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے امت مسلمہ کی زبوں حالی کی ایک ایک لم کو سمجھا اور پھر اس کی درستی کے لئے فلسفہ زندہ دیا تاکہ اس زوال آمادہ وانحطاط پذیر قوم میں پھر سے زندگی کی خواہش پیدا ہو جائے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان قوم پر قنوطیت اور یاسیت کے گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہوئے تھے اس وقت کے دانشوروں کی تحریریں اور تقریریں اپنے اندر مایوسی لئے ہوئے ہیں سوائے سر سید کے کہ جس نے قوم کو پھر سے زندگی سے روشناس کروایا اور ایک ولولہ تازہ دیا اس وقت کے شعراء کے کلام میں ناامیدی اور پست خیالی بدرجہ اتم موجود ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ مسلمان قوم حاکم سے محکوم ہو گئی تھی جب کوئی قوم عروج سے زوال کی طرف آتی ہے تو اس کے فلسفہ زندگی میں بھی زوال پذیر نظریات سرایت کر جاتے ہیں۔

اگرچہ مسلمانوں کے ہاں تقدیر کا عقیدہ جبر پہلے سے موجود تھا اس لئے کہ جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو بادشاہوں نے اپنی طرف سے کئے گئے مظالم کا رخ اپنی ذات کی طرف سے موڑ کر اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کر دیا کہ عوام کے ساتھ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اللہ کی طرف سے ہے اور اس طرح اپنی ذات کو ظلم کے اس انتساب سے بچا لیا اور پھر اس عقیدہ کو اسلامی پیرہن دے کر مقبول عام کروا دیا جو کہ اب ہمارے مقدس عقیدے کا حصہ بن چکا ہے وہ خاص قسم کی جابر بادشاہت اگرچہ ختم ہو چکی ہے لیکن وہ عقیدہ جبر ابھی تک ہمارے دل ودماغ پر مسلط ہے جس نے مسلمانوں میں بے عملی پیدا کر دی اور خاص کر ہمارے صوفیا کرام نے اس عقیدے کی نشرواشاعت میں خاص کردار ادا کیا ہے اور اسی عقیدے کی بنا پر وہ ترک دنیا کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں اس عمل کو تطہیر قلب کا ذریعہ بتاتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اس باطل نظریے کی شدید مخالفت کی اور اپنی شاعری میں اس عقیدے کے جمود کو توڑا اور مسلمان کی حرکی اور عملی زندگی کو بڑی شرح وبسط سے بیان کیا وہ فرماتے ہیں۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

ہم سے ہر اچھا ہو جانے والا کام ہمارا ہوتا ہے اور جو کام ہم سے غلط ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور ہم خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں اور کہا جاتا

ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر کر دیا گیا ہے۔

شاعر مشرق تقدیر کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تقدیر سے مراد انسان سے سرزد ہونے والے اعمال پہ جبر نہیں ہے بلکہ اس کا مادہ قدر ہے جس کے معنی پیمانے کے ہیں اور اس میں کسی چیز کی خصوصیات شامل ہوتی ہیں کہ کسی چیز کے اندر اللہ تعالیٰ نے کیا کیا خصوصیات رکھی ہیں اور ان کو مختلف مقداروں میں استعمال کرنے سے ان کی تقدیریں کس طرح ظاہر ہوتی ہیں۔ جدید سائنس نے ان کے اس فلسفہ کو بہت تقویت دی ہے۔ ان کے شاگرد خاص علامہ پرویزؒ نے اپنی کتاب "کتاب التقدیر" میں تقدیر کی وضاحت بڑے بسیط انداز سے کی ہے جس کو کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کر دیا ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

انسان کے علاوہ ہر چیز کی تقدیر اس کے اندر رکھ دی گئی ہے وہ جانور ہو یا نباتات وجمادات کوئی چیز بھی ان سے انحراف نہیں کر سکتی جبکہ انسان کی تقدیر اس کے اندر نہیں رکھی گئی ہے اور نہ اسے اس طرح کی جبری تقدیر کا پابند کیا گیا ہے بلکہ اس کی زندگی کے معیارات اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ثبت کر دیئے ہیں جن کی روشنی میں انسان کو چلنا ہے اور اپنی تقدیر قرآن مجید کی روشنی میں خود بنانا ہے اسی لئے علامہ صاحب نے کہا ہے کہ مومن انہی احکام الٰہی کا پابند ہے۔

تاریخی ادوار سے گزرتے ہوئے ایک وقت ایسا بھی آیا جب مسلمان ستارہ پرست قوم کے زیر اثر آگئے اور انسان کی تقدیر کو ستاروں سے منسوب کر دیا گیا اور کہا جانے لگا کہ فلاں شخص کے مقدر کا ستارہ گردش میں ہے اس لئے وہ زیر عتاب ہے یا فلاں شخص کا ستارہ سعد گھڑیوں میں ہے اس لئے وہ شاداں وفرحاں ہے۔۔ اس طرح انسان کا یہ باطل نظریہ ستاروں سے منسوب ہو گیا اور انسان نے اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور محسوس کرنا شروع کر دیا چونکہ انسان ستاروں کو کنٹرول کرنے سے معذور ہے ان حالات میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

علامہ صاحب نے مسلمانوں پر ستارہ پرستی کے اثرات کو ختم کرنے کے لئے اس کا بغور مطالعہ کیا کہ ایک ستارہ جو رات کو چمکتا ہے اور اپنے متعین راستوں سے گزرتا ہے اور اس کے عظیم الجثہ ہونے کے ادراک کے بعد یہ قوم اس پر مزید پختہ نہ ہو جائے۔۔ انہوں نے پوری کائنات کی وسعت میں ایک ستارے کی حیثیت کا احساس دلاتے ہوئے فرمایا۔

ستارہ کیا تری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار وزبوں

اس شعر میں انہوں نے اس ستارے کی حیثیت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے جس کو تم اپنے مقدر کا مقدس ستارہ سمجھتے ہو اس وسیع وعریض کائنات میں کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا وہ تو خود ایک نپے تلے نظام کے اندر جکڑا ہوا ہے اور ان پابندیوں میں گرفتار اور اطاعت پر مجبور ہے اس کا آپ کی تقدیر سے کیا واسطہ اتنی مجبور چیز کسی کے مقدر کا کیا بنا اور بگاڑ سکتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی عملی زندگی سے لاتعلقی اور بے عملی کا مشاہدہ کرتے ہوئے عمل کی طرف راغب کرنے کے لئے اس باطل نظریہ کو کفر قرار دیا اور مسلمانوں کو عملیت کی طرف مائل کرنے کے لئے انسان کی

آزاد پیدائش کے نظریہ کو اسلام اور مسلمانیت سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا ہے۔ ؎

ہے تابعِ تقدیر تو کافر ہے مسلمان
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

اس شعر میں انہوں نے مومن کی شان بیان کی ہے کہ وہ تقدیر کا پابند نہیں ہوتا بلکہ وہ تقدیر بنایا کرتا ہے اور اس کی زندگی منشائے خداوندی کے مطابق ہوتی ہے اور انسان کو اسی معیار سے زندگی گزارنے کے لئے تخلیق کیا گیا ہے اور اسے قرآن مجید کی دفتین میں لکھی ہوئی تقدیر کا خود مظہر ہونا ہے۔

تقدیر کے اس جبری نظریہ کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ علامہ اقبالؒ کو متعدد مقامات پر مختلف انداز سے انسان کو اس کی حیثیت کا احساس دلانا پڑا انہوں نے بڑے واضح انداز سے انسانی اختیارات کی وضاحت کی ہے۔ کہ وہ پہلے سے لکھی ہوئی تقدیر کا پابند نہیں ہے بلکہ اسے اپنی زندگی کی تقدیر خود مرتب کرنا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اندوہناک

پرچہ پریس میں جا چکا تھا کہ خبر ملی حکیم سعید قتل کر دیئے گئے۔ ہمارے نزدیک یوں تو

؎ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

لیکن حکیم صاحب کا قتل ایک فرد کا نہیں پوری انسانیت کا قتل ہے۔ ادارہ اس بہیمانہ کاروائی کی پرزور مذمت کرتے ہوئے حکومت وقت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مجرمان کو قرار واقعی سزا دلوا کر ملک میں ہر سو پھیلی ہوئی قتل و غارت کی حوصلہ شکنی کرے۔

ادارہ

عطیہ برائے ختم نبوت فنڈ

1- محترم رشید احمد بٹ بریڈفورڈ (لندن) =\80,000 روپے

خُدا نے قرآن نازل کیا تو ـــــ

اس ذاتِ گرامیؐ کی حیاتِ طیبہ کے اہم گوشوں کو بھی اپنے دامن میں محفوظ کر لیا جس پر قرآن نازل کیا گیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ

حضورؐ کی سچی اور قابلِ اعتماد سیرت

(جسے نوعِ انسانی کے لیے بہترین نمونہ بننا ہے) وہی ہو سکتی ہے جس کی بنیاد ان گوشوں پر ہو

مفکرِ قرآن نے اپنی عمر بھر کی کاوش کے بعد اس سیرتِ طیبہ کو اپنی مایہ ناز کتاب

مِعراجِ انسانیّت

میں مرتب کیا ہے

جس سے اُس ذاتِ اقدسؐ کی عظمت اُبھر کر دُنیا کے سامنے آجاتی ہے

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مدت ہوئی ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مصنف کی نظرِ ثانی نے اسے جدید پیکر میں پیش کیا ہے
اِس نئے ایڈیشن کی ضخامت تقریباً پانچسو صفحات ہے!

قیمت : سٹوڈنٹ =/180
اعلیٰ =/360

اسلام — مذہب نہیں

دین ہے۔ یعنی نظامِ حیات جو ایک آزاد مملکت میں پروان چڑھتا ہے۔

اس نظام کی تشکیل کا آغاز عہدِ نبوی میں ہوا لیکن وہ اپنے عہدِ شباب تک

خلافتِ فاروقیؓ

میں پہنچا۔ اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ حیات دیکھنے کے لیے اُس عہد کی صحیح تصویر کا سامنے آنا ضروری ہے۔ اسے پرویز صاحب نے اپنی مدت العمر کی تحقیق و کاوش کے بعد اپنی

عظیم تصنیف

شاہکارِ رسالتؐ

میں پیش کیا ہے۔ اس کے آخری باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ

عہدِ فاروقیؓ کے بعد اسلام پر کیا گزری؟

اور وہ کس طرح دین سے موجودہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اس کتاب نے ہماری فکری دنیا میں

انقلاب پیدا کر دیا ہے

بڑی ضخیم کتاب ہے

قیمت: سٹوڈنٹ =/180

اعلیٰ =/360

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل۔ (کراچی)

جہاں قانون بکتا ہے

جب سے آئین میں 15 ویں ترمیم کا بل اسمبلی میں پیش ہوا ہے اس پر تین طرح کے ردعمل سامنے آئے ہیں۔ ایک اس کی مخالفت میں جو کہ کچھ سیاسی پارٹیوں اور وکلاء کی طرف سے ہے۔ دوسرا ردعمل موافقت میں ہے جو حکومتی پارٹی اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے ہے۔ تیسرا ردعمل طلوع اسلام اور قرآنی فکر رکھنے والوں کی طرف سے ہے اور وہ یہ کہ قرآن اور سنت کی جو اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے اس میں قرآن کریم تو بالکل واضح اور بین ہے لیکن سنت کی بنیاد کیا ہو گی اس کا تعین نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ یہ کہنا کہ شخصی قوانین میں ہر فرقہ کے لوگ اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں گے۔ نہ صرف یہ کہ فرقہ بندی کو قانونی تحفظ دینا ہے بلکہ عملی طور پر یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک ہی ملک میں دو طرح کے قوانین ہوں۔ کیونکہ کسی قسم کے تنازع کو حل کرنے کیلئے حکومتی اداروں کو مداخلت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ لہٰذا کوئی قانون شخصی ہو نہیں سکتا۔

اس پہلو پر کسی قسم کا ردعمل سامنے نہیں آیا کہ شریعت کا نفاذ ممکن کیسے ہو گا؟ اس بات سے نہ عام آدمی بے خبر ہے نہ حکومتی اہل کار کہ پاکستان میں کسی بھی قانون پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ رشوت اتنی عام ہو گئی ہے کہ اس نے تمام قوانین معطل کر رکھے ہیں۔ اس کے خلاف پہلے تو شاید کوئی آواز اٹھتی ہو گی مگر اب نہ تو کوئی اسے جرم سمجھتا ہے نہ گناہ۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ جو رشوت نہ دیتا ہو نہ لیتا ہو وہی سب سے بڑا مجرم ہے۔ ملک میں معمولی سی تعداد ابھی باقی ہے جو رشوت سے بچنا چاہتی ہے۔ لیکن ان کے ساتھ سب سے بدترین سلوک ہوتا ہے۔ ان کے کام کوئی نہیں کرتا نہ ان کی کہیں شنوائی ہوتی ہے۔ انہیں بے وقوف، ہٹ دھرم اور ضدی کہا جاتا ہے۔ میں نے عدالت کے احاطہ میں لگے ہوئے "الرَّاشِی وَالْمُرْتَشِی کِلَا هُمَا فِی النَّار" کے بورڈ کے زیر سایہ رشوت دیتے لیتے دیکھا ہے۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں اس حدیث کو نہیں مانتا تو تمام راشی مل کر میری گردن مار دیں گے کہ یہ شخص رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا انکار کرتا ہے۔ لیکن عملاً" سب انکار کر رہے ہیں۔

مجھے بیرون ملک سے مستقل طور پر آئے ہوئے تھوڑا سا عرصہ گذرا ہے اور اس تھوڑے سے عرصہ میں یہ اندازہ بخوبی ہو گیا ہے کہ ملک میں قانون کی کیا وقعت ہے۔ یہاں قانون فروخت ہوتا ہے اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ جتنا بڑا جرم اتنی بڑی سزا نہیں بلکہ اتنی بڑی قیمت۔ یہاں ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی سے لیکر قتل تک کے جرم سے بچنے کی قیمت ہے۔ ڈاکے کے مال غنیمت کے مطابق قانون کا حصہ ہے۔ یہاں قانون کا میزان نہیں ہوتا بلکہ دولت کا ترازو ہوتا ہے جس کے پلڑے میں اگر قاتل زیادہ رقم ڈال دے تو وہ بری ہو جاتا ہے۔ کونسا

ایسا جرم ہے جس کی قیمت مقرر نہیں ہے۔ معاشرے میں جرائم کی شرح جتنی بڑھے گی اتنا ہی مال بنانے کا موقع بھی۔

ایسے معاشرے جہاں قانون دولت کی لونڈی بن کر رہ گیا ہے وہاں نفاذ شریعت کے اعلان سے نہ تو کسی کو خوش فہمی میں مبتلا ہونا چاہئے اور نہ کسی کو خدشات لاحق ہونے چاہئیں۔ کیونکہ شرعی قوانین کا حشر بھی وہی ہو گا جو دوسرے قوانین کا ہو رہا ہے۔ کیا تمام رشوت خور اور بدعنوان اہلکار اس انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ شریعت نافذ ہو اور وہ تائب ہو کر نہایت دیانت دار بن جائیں؟ جی نہیں انہیں تو صرف اتنا کرنا ہو گا کہ وہ ان قوانین کی قیمت مقرر کر کے انہیں فروخت کیلئے پیش کر دیں۔ شاید کچھ لوگوں کو ابھی تک یاد ہو کہ ایک آمر نے اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے جب اسلامی حدود کے نفاذ کا اعلان کیا تھا تو اس وقت پولیس کے اہلکاروں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اگر اتنی رقم دو گے تو مقدمہ حدود آرڈیننس کی بجائے عام قانون کے مطابق درج کیا جائے گا ورنہ حد لگ جائے گی۔ آج تک کتنے لوگوں کو اسلامی حدود کے مطابق سزا ملی ہے؟ جب سے نظام زکوٰۃ نافذ ہوا ہے غریبوں کی حالت تو نہیں بدلی البتہ بہت سے مولانا حضرات کے پاس گاڑیاں آگئی ہیں۔ یہ سب کچھ ان مدرسوں کی بدولت ہے جو صرف کاغذات پر ہیں۔ اس کے علاوہ زکوٰۃ فنڈ کہاں کہاں خرچ ہوتا ہے عام شہری کو اس کی خبر نہیں۔

محض قوانین کے اعلان سے کسی قسم کی تبدیلی نہیں آسکتی۔ ان پر عمل درآمد کرانا نہایت ضروری ہے جب تک معاشرے میں رشوت کا خاتمہ کر کے قانون کی بالادستی قائم نہیں کی جائے گی کسی قسم کے مثبت نتائج سامنے نہیں آئیں گے۔ ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب عوام چاہیں گے۔ سیاسی یا مذہبی رہنماؤں سے کسی قسم کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ ایسی تبدیلی قرآن کریم کے بتائے ہوئے اصولوں پر دل کی گہرائی سے ایمان لانے اور ان پر عمل کرنے سے ہی ممکن ہے۔ ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے وقت کیا ہمارے ذہن میں وہ نتائج سامنے نہیں ہوتے جو ہمیں بھگتنے ہوں گے یا صحیح طور پر ہمارا ان پر ایمان ہی نہیں ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کو سوچنا ہو گا کہ اگر وہ فی الواقع مسلم ہے اور فی الحقیقت اس کا اللہ اور اس کی کتاب پر ایمان ہے تو پھر وہ اس کے بتائے ہوئے راستے پر کیوں نہیں چلتا؟ اور اس کے بعد بھی اپنی روش تبدیل نہیں کرتا تو چاہے خود کو مسلمان کہتا اور کہلواتا رہے' اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ مسلم نہیں ہے۔ جب تک پاکستان کے عوام کی اکثریت اپنی اصلاح نہیں کرتی اس ملک میں کسی قسم کی تبدیلی ہرگز نہیں آسکتی۔ جو کوئی پاکستان کے حالات درست کرنا چاہتا ہے اسے اپنے آپ کو قرآنی اصولوں کے تابع کرنا پڑے گا۔

اطلاع

علامہ رحمت اللہ طارق صاحب کی نئی تصنیف تفسیر برہان القرآن بزم طلوع اسلام لاہور کے

مالی تعاون

سے مبلغ =/535 روپے میں خریدیں۔

فون 685 4528 , 571 4546, 654 9367, 682 4077

علمی، فکری، تحقیقی مجلّہ سہ ماہی آواز

کا تازہ شمارہ چھپ کر آگیا ہے۔ اس شمارے کے موضوعات مندرجہ ذیل ہیں۔

اسلام
- العروۃ الوثقیٰ (خواجہ اظہر عباس)
- جن (علامہ عرشی امرتسری)
- مسئلہ ملکیت زمین (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)
- مسئلہ ملکیت زمین پر ایک نظر (پروفیسر رفیع اللہ شہاب)
- علماء کرام کا دینی نظریہ (علامہ نیاز فتح پوری)

عمرانیات
- پیار کی ثقافت (سبطِ حسن)
- تشدد کی لہر (آئی اے گوہر)
- ریاست اور مذہب (وجاہت مسعود)

فلسفہ
- تعلیم میں مذہب کا مقام (برٹرینڈ رسل)
- جدید آفات (ڈاکٹر علی شریعتی)
- صارفیت کا مغربی فلسفہ (ڈاکٹر سعادت سعید)

تاریخ
- داستانِ مغلیہ (سجاد باقر رضوی)
- مسلم قومیت (رحمت اللہ طارق)
- قوم پرستی اور صنفی تفریق (روبینہ سہگل)
- اندھا دانشور (ڈاکٹر طہٰ حسین)

حالاتِ حاضرہ
- پنج سالہ منصوبے (سلطان علی برق)
- صدر کاسترو اور کیوبا (راشد رحمان)

آرٹ
- فنونِ لطیفہ (احسان بی۔اے)

پر تحریروں سے مزین

ملنے کا پتہ

آواز فاؤنڈیشن برائے تعلیم

31 سیکنڈ فلور، حفیظ سینٹر، مین گلبرگ لاہور 54660

Email: awaz@usa.net فون: 7122981, 5764484 فیکس: 7122981

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظام پاکستان کے متعلق

علامہ اقبالؒ کا خط، قائداعظمؒ مرحوم کے نام

پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کا دیا ہوا ہے۔ حصول پاکستان کے بعد، وہ پاکستان میں کس قسم کا نظام دیکھنا چاہتے تھے؟ اس کے متعلق انہوں نے اپنا نظریہ اس خط میں واضح کیا تھا جو انہوں نے 28 مئی 1937ء کو قائداعظمؒ کے نام تحریر فرمایا تھا۔ انہوں نے اس خط میں پہلے یہ بتایا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہونا چاہئے اور اس کے بعد یہ کہ اگر ان کے تصور کے مطابق مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم ہو گئی تو اس کا نظام کن خطوط پر متشکل ہونا چاہئے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

لیگ کو آخرالامر یہ طے کرنا ہو گا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذب نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئین جدید (یعنی 1935ء کے آئین) کے مطابق، اعلیٰ ملازمتیں، امراء کے بیٹوں کے حصہ میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہو گا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔۔۔۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دور حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (Development) دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامان پرورش (Subsistance) ضرور مل جاتا ہے۔ (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (Social Democracy) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کیلئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہو گا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہو گا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔

چاروں طرف سے آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ

- مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے ثابت کر دیا ہے کہ دو قومی نظریہ غلط ہے۔
- قائداعظمؒ نے خود اپنی 11 اگست کی تقریر میں اس سے رجوع کر لیا تھا۔
- قومیت کا مدار وطن کی جامعیت ہے نہ کہ ایمان (نظریہ) کا اشتراک۔
- مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہئے ورنہ رہا سہا پاکستان بھی ختم ہو جائے گا۔
- انسانی زندگی میں کوئی قدر نا قابل تغیر نہیں۔ ہمیں اپنے فیصلے حالات کے مطابق کرتے رہنا چاہئے۔
- اگر ہم پاکستان کی سلامتی چاہتے ہیں تو بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کر لینی چاہئے۔
- پاکستان میں متعدد قومیں بستی ہیں اس لئے صوبجاتی خود مختاری ضروری ہے۔
- قائداعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ اسی قسم کا پاکستان بناتے۔

سوال یہ ہے کہ

اگر قائداعظمؒ زندہ رہتے تو وہ کس قسم کا پاکستان چاہتے------بالفاظ دیگر قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان کیا تھا؟

یہ وقت کا نہایت اہم سوال ہے جس کے صحیح جواب پر پاکستان کے مستقبل کا دارومدار ہے اور یہ جواب قائداعظمؒ کے تحریک پاکستان کی دینی اساس سے متعلق ذاتی مشیر اور تحریک پاکستان گولڈ میڈلسٹ علامہ پرویزؒ کی تالیف میں ملے گا۔ جس کا عنوان ہے۔

قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان

ضرورت ہے کہ اسے قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں عام کیا جائے کہ پاکستان کے مستقبل کا انحصار ہی ان کے زاویۂ نگاہ کی درستی پر ہے۔

☆☆☆ قیمت سٹوڈنٹ ایڈیشن =\100 اعلیٰ ایڈیشن =\200 ☆☆☆

IQBAL THE UNIVERSAL POET

By
Ms. Shamim Anwar

We all talk about the greatness of Iqbal. A lot has been written on him and some of his work has been translated. In future, people and scholars in greater numbers will realise the nature of his contribution to humanity, which is eluding the petty-minded politicians and even some intellectuals of today. I am using the word "humanity" because he speaks for humankind and not specifically for any particular group.

I do not claim to be a scholar on Iqbal, I do not even know proper Urdu, leave alone Persian, However, I owe a tremendous lot to Allama Parwez in the understanding of Iqbal and I shall attempt to convey this understanding.

The greatness of Iqbal lies in the fact the he challenged, in the light of the Quran, the onrush of certain socio-economic and political concepts that are dominating human thoughts, worldwide. Concepts such as "nation-state", "secularism", "western democracy" and "capitalist economy" evolved through European experience, were first established in the Americas, and then the non-Western world in Asia and Africa.

Unfortunately, the political, economic and above all, intellectual dominance of the West, inevitably makes the former subject races adopt these concepts unthinkingly and uncritically by way of blind imitation. Iqbal is one of the lone examples, who although influenced by these concepts in his youth, soon rejected them, having lived in Europe and critically watched and studied the global scenario.

While admitting the European Renaissance Spirit (he himself was a Renaissance Man) he was concerned about the course it took. Leading to bloody wars of Reformation and Counter-Reformation, the identity of

irrespective of any consideration, race, sex, country or language, are equal and honourable can be overturned by a majority vote, is a possibility that is frightening. This is a Quranic permanent value, and even if not a single vote is in its favour it remains the truth and a fact in human existence. No doubt the freedom of expression in spoken and written word, the sense of participation through elections and the institution of debate and exchange of views are laudable on going accomplishments, all the more so since they were acquired through trial and error. But the essence of democracy is still missed out. The evil lies at the root of "Power"; whether it lies in the "king's will" or the "general will". Power is not a human characteristic, no one has the right to exercise power over others, not even 51 over 49. It all ends up in tyranny. Thus Iqbal concludes that power lies in the Quranic permanent values the source of which is divine. Power is divinity, the source of universal creation and universal laws, concrete or abstract.

Talking of European experience, a series of revolutions toppled not only the mighty kings but also the whole enervating feudal structure. This in itself was a tremendously liberating and energising exercise. But it was followed by mechanised industry and capitalist economy, based on materialistic philosophy of life. Man, a mere extension of the animal is allowed to amass wealth, this being the incentive to work. Profit is his aim, he seems to live for it and die for it. It is like a bottomless pit, for after all humans have the potential to live for greater things. Matter is a base to stand on, not the aim of life. So the race goes on, ending in imperialism, subjugation of one over the other. Formerly, it was a visible "political" imperialism; today it is an invisible "economic" imperialism. The whole system, its basis and its incentives are exploitative, cruel and ruthless. As a consequence, Iqbal's Quranic insight warned the world of the First World War and later, The Second World War. His call was that the resources of the earth, or for that matter, the earth itself, is a Divine creation and possession. In His infinite bounty, He has left it open and free for humankind, to be used and enjoyed, not to be possessed. Any one claiming possession challenges Divinity as His rival. This is where we all go wrong and we all suffer.

Universal Christendom was lost and its place was taken by territory (`desh'), language, race and traditions, euphemistically called "culture". Thus was Europe spilt into innumerable nation-states, so much so, that following suit, there are now 180 "nation-state" members of the U.N.O. this splintering of humanity is simply based on whether one is tall or short or stocky, black or white or brown, the nose flat or short, eyes straight or slanting, etc. Further, each one worships its own territory as the best in the world, as if the rest was created by the devil; each one prides on its own cuisine showing off ones `seekh-kabab, pulao, lentils, roast-meat or puddings. The slogan is "my country, right or wrong". The situation is pathetic and below human dignity. Iqbal's clarion call was that the whole planet earth was beautiful and it was a one single global home for one human family. If there is to be any division of humankind, it is on the basis of values alone. This is the only area of activity where humans can make fundamental choices; the rest is passive and accidental by birth. It is a pity that being committed to values is considered being conservative and communal, while the worship of `desh' is modern!

With the nation-state comes along the issue of "secularism", again considered as a very modern idea. Sure, if it is basically getting rid of priesthood in churches, temples and mosques, it would be a splendid achievement, but what has happened is that the baby has been thrown away with the bathtub. To divorce values from our public life, to indulge in Machiavellism and become the biggest of devils as Cavour, the Italian unifier said about himself, is no achievement indeed. The worse part of it is that human personality has been spilt into two, the two half's of us moving in different, almost opposite directions. If this is not schizophrenia, what is it? Iqbal spoke about the "whole Man" and the unity of life. His `mard-e-momin' or a developed personality pulsates in unison, without any spilt into personal and public behaviour.

Now, having lost the sense of values, the standard of right and wrong became subject to the majority vote. What may be right today could become wrong tomorrow just because 51 votes were reduced to 49. In other words it is one man who decides the fate of a whole people, and this is supposed to be democracy. For example, the value that all human beings,

How can this suffering be alleviated? The human race feels ever so unprotected. Following the Quranic direction, Iqbal's aim was to establish a strong and resourceful centre that could challenge the injustices rampant in different shapes and forms. After all, it is high time that groups of people somewhere thought in terms of humanity and protected the un-protected worldwide, under the guidance of Quranic permanent values. Seeing from these angles, it would be more appropriate if Iqbal was described as the "Universal Poet" rather than the "Poet of the East" as we have been doing so far. There is no East or West in the Quranic perspective. Humanity is an integrated one whole, composed of integrated, whole individuals. Thus describing him i.e. Iqbal as a "Universal Poet" from now onwards would be a tribute that we can pay him in his 60th death anniversary.

Courtesy "Dawn"

✿ ✿ ✿ ✿ ✿ ✿

We regret the mis-pagination of English section -- (Edito

FOR ALL PUBLICATIONS
OF
ALLAMA GHULAM AHMED PARWEZ
AND RECORDED LECTURES ON QURAN
PLEASE CONTACT
TOLU-E-ISLAM TRUST

ACCOUNT NO. CURRENT 4107-35
MAIN GULBERG BRANCH
HABIB BANK LIMITED LAHORE

PHONE : 5714546, 5764484, 5753666
FAX : 092 - 42 - 5764484
EMAIL : trust@toluislam.com
INTERNET : http://www.toluislam.com

سیفٹی سیلرز

بنیاد سے چھت تک مکمل حفاظت

کم خرچ اور دیرپا نسخے

ہمارے 38 سالہ تجربہ سے فائدہ اٹھایئے۔

پیش خدمت ہیں

1- جیو ٹائڈ ڈیپ کورس بمعہ پرما سیل کوٹنگ برٹش سٹینڈرڈ BS 6398 :
(Jutiod Damp Course & Perma Seal Coating British Standard BS 6398)

9 اور 13 انچ کی پٹیاں بنیادی دیواروں میں بچھا دی جاتی ہیں جس سے عمارت تاعمر نمی اور سیلن سے محفوظ رہتی ہے۔

2- سیف سیل ڈیمپ وال کوٹنگ :
(Safe Seal Damp Wall Coating)

بیرونی دیواروں کو نم سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس میں کالا تیل وغیرہ کی ملاوٹ نہیں ہے' گرم اور ٹھنڈے دونوں گریڈوں میں دستیاب ہے۔

3- بچومن کمپاؤنڈ اور سیف سیل روفنگ فیلٹ :
(Bitumen Compound & Safe Seal Roofing Felt)

یہ برٹش اور امریکن سٹینڈرڈ کے مطابق ہے۔ ہم گارنٹی کے ساتھ چھتوں کی واٹر پروفنگ کرتے ہیں۔

4- سیلو کریٹ واٹر پروفنگ پاؤڈر :
(Sealo Crete Water Proofing Powder)

فرشوں اور پانی کی ٹینکیوں کیلئے ہماری سروسز پر کم خرچ بالا نشین والا محاورہ صادق آتا ہے۔

چھوٹے بڑے شہروں میں ایجنسیاں دستیاب ہیں۔
ہارڈ ویئر اور پینٹ ڈیلرز رجوع کریں۔

جان محمد آرکیڈ - 93 فیروز پور روڈ' اچھرہ' لاہور
فون : 7552803-417254 فیکس : 092-42-7573615

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL® AND QUAID-E-AZAM ®

R L NO. CPL-22
VOLUME : 51
ISSUE : 11

Monthly
Tolu-e-Islam

AMBER®
CAPACITORS

The National Name For International Quality

AMBER —The most versatile range of single and three phase capacitors in world class quality—quality that combines Italian and Japanese technology—technology that takes the form of strict QC and performance testing at every stage of production. Manufactured to international standards and specifications.

Our range of products include:

- Motor Start-Run Capacitors
- Fluorescent Lamp Capacitors
- Power Factor Improvement Capacitors

AMBER® CAPACITORS The national name for international qualit

We also manufacture to your specifications.

AMBER CAPACITORS LIMITED

Climax House, 16-Link McLeod Road, P.O. Box 468, Lahore-Pakistan
Phone: +92 42 722 5865 & 722 6975 Fax: +92 42 723 2807 & 586 6617 Tlx: 44335 AMBER PK